کوہِ دماوند

قرۃ العین حیدر

کوہِ دماوند

ایران کے متعلق رپورتاژ

کوہِ دماوند

قرۃ العین حیدر

مکتبۂ اُردُو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ——— سرفراز احمد
اشاعت ——— ۱۹۷۹ء
مطبع ——— منظور پریس لاہور
قیمت ——— ۱۰/- روپے

ترتیب

پیش لفظ

ایک مڈل کلاس ایرانی لڑکی ملکۂ ایران کس طرح بنی۔ شہنشاہ آریہ مہر نے ولی عہد کے تمنا میں کس طرح دو بیویوں کو طلاق دے کر فرح دیبا سے شادی کی۔ "کوہِ دماوند" میں یہ دلچسپ اور عبرت آموز کہانی ملاحظہ کیجئے۔ ۱۹۷۰ء میں شہبانو نے ایران کی کہانی جو انہوں نے خود قرۃ العین حیدر کو سنائی تھی۔ جس وقت ایران میں طوفان آنے سے قبل کی خاموشی طاری تھی۔

قرۃ العین حیدر اور اس کا ادب ایک نظر میں

سلمیٰ صدیقی

قرۃ العین حیدر کا نام اردو دنیا میں ایک بڑا اور جانا پہچانا نام ہے اُن کے بڑے کارناموں سے بھی ہم ناواقف نہیں ہیں۔ تقسیمِ ملک سے پہلے بھی عینی (قرۃ العین حیدر کو اُن کے دوست و احباب اور اعزا اسی نام سے پہچانتے ہیں) کے افسانے اپنے ہیئت، اور موضوع کے اعتبار سے ادبی حلقوں کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب تھے۔ اردو کے ادبی ماحول اور اسلوب میں عینی کے افسانے ایک قابلِ قدر کوشش ہی نہیں۔ ایک قابلِ قدر اضافہ بھی رہے ہیں۔ عینی کے ذہنی سفر میں ان کے افسانے ان کے ساتھی اور ہمسفر رہے ہیں۔ تیس پینتیس سال کی لمبی مسافت کہانی اور کہانی کار ساتھ ساتھ طے کی ہے۔ اور جو کچھ ان برسوں میں کہانی کار پہ بیتی ہے۔ وہ سب ان کے افسانوں اور کرداروں نے بھی بھگتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے عینی اور ان کی کہانیاں ایک بڑے خوشگوار، متوازن، بے فکر اور کھلنڈرے اونچے مڈل کلاس طبقے میں اس طرح رچی بسی تھیں کہ "ہندوستان چھوڑو تحریک" اور بنگال کے قحط کے مہیب سائے اور سیاسی پرچھائیاں

بھی کہانیوں اور کہانی کار کے طلسمی ماحول سے دامن بچا بچا کر نکل جاتے تھے۔ عینی اور ان کی کہانیوں کا ایک بڑا مسئلہ ان کی عمر کا مسئلہ بھی رہا ہے۔ بیس سال کی عمر میں بیس صدیوں کا احاطہ کر لیا۔ ان کا قبل از وقت ذہنی پختگی اور لامحدود مطالعے کی ایک مثال بھی ہے۔ عینی ایک عجیب وغریب ماحول کی پیداوار ہیں (انسانوں کے لئے اور نسلوں کے لئے پیداوار کا لفظ بہت مناسب اور بھرپور لفظ ہے۔

عام طور پر ہوتا یہی ہے۔ کہ اپنی پیدائش میں خود کسی کا دخل یا خواہش کو دخل نہیں ہوتا۔ لیکن عینی بی بی نے تو اپنی پیدائش کے لئے بھی شاید اپنے والدین اور ماموں خود ہی منتخب کئے تھے۔ سیّد سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد حیدر (ان کے والدین) کے گھر میں عینی کی ولادت نہایت موزوں و مناسب تھی۔ کیونکہ عینی اگر کسی معمولی یا متوسط خاندان یا والدین کو شرفِ ولادت بخشتیں تو اپنے لئے اور اپنے ماں باپ کے لئے بڑی پریشانیوں اور مسائل کا کھڑاک پھیلا دیتیں۔ یعنی "سب پہ جس بوجھ نے گرانی کی" وہ ان ادیب والدین نے اٹھا لیا اور اپنی بہترین شریفانہ اور ادبی و علمی صلاحیتیں عینی کی پرداخت پر صرف کیں۔ بہترین تعلیم اور بہترین تربیت کے ساتھ ساتھ ایک ایسے ماحول میں عینی کی صلاحیتیں پنپنے اور نکھرنے لگیں۔ جو ادب کے لئے انتہائی سازگار تھا۔ ایسی خوشگوار مطمئن، بھرپور اور بے فکر زندگی کے گہوارے میں عینی نے اپنا راستہ منتخب کیا۔ اپنے والد سے عینی کو وہی تعلق تھا۔ جو عام طور سے بیٹی کو باپ سے ہوتا ہے۔ لڑکی کا پہلا ہیرو اس کا باپ ہی ہوتا ہے۔ عینی کے یلدرم کی حیثیت باپ، معلّم، ساتھی، رہبر، دوست بہی خواہ اور ناصح اور نقاد بھی تھی۔ اتنے بہت سارے رشتے ایک انسان میں جمع

تو وہ انسان صرف ایک فرد نہیں ایک عقیدہ یا نظریہ بھی بن جاتا ہے اور ایسے ہی عقیدوں سے زندگی اور اس کی بڑائیوں پر ایمان مستحکم ہوتا ہے۔

ہم بڑھاکی پہچان اپنے بڑوں ہی سے کرتے ہیں !! ایک طرف عینی انگریزی سکولوں میں انگریزی تک بندیاں حفظ کررہی تھیں۔ دوسری طرف گھر میں خالدہ ادیب خانم کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر سنتیں۔ ایک طرف جیک اینڈ جل پہاڑی پر چڑھتے اور گرتے رہتے اور دوسری طرف خوارزم شاہ کا مسودہ پھیلا ہوتا۔ ایک طرف یونین جیک لہراتا، دوسری طرف ایران کی نڈر بے باک، جانبازہ اور سرفروش مجاہدہ قرۃ العین طاہرہ جس کے نام پہ قرۃ العین کا نام رکھاگیا، کی وہ فریادسنتیں جوکسی لے کی پابند نہیں تھی۔ ایک طرف ہنسور اور مراد آباد اور جونپور کی حویلیوں میں اور مجلسوں میں شرکت کرتیں اور دوسری طرف ازبیلا تھوبرن کالج کے ایوان میں کافی ہاؤسز میں اور ادبی جلسوں میں زندگی اور ادب کے جدید ترین رجحانات پر غور و فکر اور اظہار خیال کرتی رہتیں۔ ایک طرف انگریز عہدیداروں اور دلیسی جاگیرداروں طرز و باش ملاحظہ فرمائیں۔ دوسری طرف ایک ابھرتی ہوئی فرقہ واریت اور زوال پذیر انسانیت سے دوچار ہوتیں۔ عینی کی خوبصورت کانچ کے گلدان میں پھول کی طرح کھلتی زندگی کو پہلی گہری اور ایری، مضرب یلدرم کی اچانک وفات سے پہنچی۔ موت کو محاورے کے طور پر استعمال کرنا بہت آسان اور بے ضرر موت ہوتا ہے۔ مگر جب موت کا نشانہ سیدھے سیدھے اپنے دل کا شیشہ بن جائے تو زندگی اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود بے معنی بے ثبات اور بے رحم محسوس ہوتی ہے۔ عینی جیسے ذہن و دل کی لڑکی اس پہلی چوٹ کی شدت سے جس طرح

دوچار ہوئی۔ اس کا صحیح تجزیہ کرنا ہو تو "پھول کھلتے ہیں" کا مطالعہ ضروری ہے۔ یلدرم کی موت پر بہتوں نے لکھا ہے۔ لیکن عینی کے اس "نوحے" نے جو غم و اندوہ کے روایتی فریم سے بار بار باہر نکل آتا ہے "اپریل کے سرسراتے ہوئے لمحوں" کو اپنا غمگسار مان کر آرزوؤں کے چلمن کے پرے وہ سب کچھ دیکھ لیا اور دکھا دیا۔ جو صرف موت کے روزن ہی جھانکتے ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ احساس کی یہ شدت، جذبے کی یہ تمازت اور غم کی یہی وہ بڑی حقیقت ہے۔ جو عینی کی تحریر میں کبھی یادوں کا کارواں اور کبھی شعور کی لہر بن جاتی ہے۔ جسے قرۃ العین حیدر کا قاری کبھی ورجینیا وولف اور کبھی جیمز جوائس کے حوالے سے سمجھنا اور پڑھنا چاہتا ہے۔ میں نے عینی کے اسٹائل کو کبھی کسی دوسرے اسلوب، اور اصول کے خانے میں بانٹ کے نہیں دیکھا۔ یہ سچ اور عینی کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ اپنے مطالعے کی وسعتوں کو اپنی تحریر میں اس طرح سمونا چاہتی ہیں اور اپنے قاری کے ذہن سوجھ بوجھ پہ انہیں اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ سمجھتی ہیں جو کچھ وہ لکھتی ہیں۔ صرف وہی نہیں بلکہ جو کچھ وہ محسوس کرتی ہیں۔ وہ سب کچھ ان کا قاری اور نقاد بھی محسوس کرے گا۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ بیس صدی کا طویل سفر انہوں نے بیس سال میں طے کیا تھا۔ اس بات کا دوبارہ ذکر یوں ضروری ہے کہ عینی نے اپنا پہلا ناول "میرے بھی صنم خانے" بیس سال سے بھی کم عمر میں لکھا تھا۔ لیکن ان کے وہ تمام کردار یا صنم اس وقت بھی اتنے ہی پختہ اذہان کے مالک تھے۔ جتنی کہ عینی آج ہیں۔ "میرے بھی صنم خانے" سے "آخری سب کے ہمسفر" اور سوانحی ناول "کارِ جہاں

دراز ہے" کی دونوں جلدوں تک اور درمیان میں سفینۂ غم دل اور آگ کا دریا"
"سیتا ہرن اور چائے کے باغات" جو کردار ہیں۔ وہ کبھی کبھی ایک ہی اور کہیں کہیں
جڑواں نظر آتے ہیں۔ پہلا کردار ڈاکٹر سلیم کا تھا۔ لیکن وہ نہیں نہیں رہا اور
بار بار نام بدل کے بھیس بدل کے مقامات آہ و فغاں بدل بدل کے ہم سے ملتا رہا
ہے۔ چنانچہ سلیم، فواد، ریحان اور ابوالریحان، صرف شعور کی لہروں پہ نہیں۔
آواگون کے سلسلے میں بھی ملتے رہتے ہیں۔ روشنی، چمپا سیتا اور دیپالی، جنم جنم کی
وہ دکھی روحیں ہیں جنہیں کہیں پناہ نہیں ملی۔ تو وہ قرۃ العین حیدر کی تحریر
میں پناہ گزین ہوگئیں۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ عینی سے کہوں کہ ہاتھی دانت
کے جس ٹاور میں یہ دکھیا مقید ہیں انہیں اپنے قلم کی جنبش سے اس یکسانیت کی المناک
تنہائی سے نجات دو۔ اور کبھی ان کو اپنے جنم جنم کے بچھڑے ساتھیوں سے ملنے
دو۔ ہیرو اور ہیروئن کے آپس کے رشتے کے سلسلے میں قرۃ العین حیدر کا انتہائی
رہبانہ سلوک ان کرداروں ہی کو نہیں۔ پڑھنے والوں کو بھی کھلتا ہے۔

عینی کو سچائی بیان کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ انداز بھی آتا ہے۔ لیکن سچ کا
صرف ایک ہی رخ یعنی "پروفائل" دکھانے پر اکتفا کرتی ہیں۔ سچ کا پورا چہرہ
ممکن ہے بہت حسین نہ ہو۔ لیکن مکمل تو ہوگا۔ عینی کی کتاب "کارِ جہاں دراز
ہے" میں یہ بات ان کے قارئین اور بعض ناقدین نے محسوس کی ہے کہ کتاب
جو ایک پورے سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں بڑے خوبصورت پیرائے میں
لکھی گئی ہے۔ اس میں دنیا جہاں کی ہر شئے کا ذکر ہے۔ بے شمار خوبصورت
اور اہم رستوں اور رشتے داروں کا احوال ہے۔ لیکن خود قرۃ العین حیدر

اس گروپ فوٹو میں نظر نہیں آئیں - یہ بات مضمون کہانی انشائیے اور دوسری اصنافِ سخن میں انتہائی مستحسن خیال کی جاتی ہے - لیکن اپنی سوانح حیات میں اپنا شامل نہ ہونا یا اپنی ایک جھلک دکھا کے کسی ماموں، ممانی، چچا، چچی، خالہ خالو، بھائی بہن، بھتیجی، بھتیجوں کے پیچھے چھپ جانا قرۃ العین حیدر کے پرستاروں کو کچھ نامناسب محسوس ہوا - کوئی کیسے مان لے کہ عینی صرف اپنے اونچے حسب ونسب اور بڑے رشتے داروں اور ان کے دامانِ عافیت میں محصور رہی ہیں - عینی کو اپنا پورٹریٹ بنانے بنانے میں کسی خاندان، مصلحت مروت بخل، یا انکسار سے کام نہیں لینا چاہیئے - وہ اردو ادب کا ایک اہم ستون ہیں - اور ان کے پرستاروں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں، جو اُن کی زندگی اور تحریر میں انتہائی دلچسپی رکھتے ہیں - ان کے ایسے ہی عقیدت مند اور مداح فن اور شخصیت کے مدیر صابر صاحب ہیں - جنہوں نے "کارِ جہاں دراز" ہے دو نہایت اہم جلدیں زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے ہمیں عطا کی ہیں -

---

حصّہ اوّل

جھلملاتے سپید دریچوں کے باہر خنک نیلگوں دھندلکے میں شمرآن کی ان گنت روشنیاں چراغِ لالہ کی طرح جھلملا رہی ہیں۔ ان کے عقب میں اودی چوٹیوں پر خسروِ عجم کے عظیم الشان برقی تاج جگمگاتے ہیں۔ بادل کوہ دماوند پر سے مؤدب خادموں یا متحیر سیاحوں کی مانند آہستہ آہستہ گزر رہے ہیں۔ چند لمحوں بعد یہ کاروانِ سحاب پہاڑیوں کے ادھر توران پہنچ کر ایک اور جشنِ پرشکوہ کا تماشا کرے گا۔ بسیط، منور، بیکراں رات میں یہ کاسنی بادل اندھیرے کیسپین سے اٹھے ہیں۔

البرز کی گونجتی ہوئی چٹانوں پر سیمرغ پردوں میں چونچ چھپاتے بیٹھا اونگھ رہا ہے اور باخبر ہے کہ چند فرسنگ پرے کوہ طالقان اور کیسپین کے درمیان پراسرار جنگلوں، چراگاہوں میں پراچنے والا لال دیو نفیلیں بجاتا ہے کہ ہفت خواں طے ہوئی اور سفید دیو بالآخر مات کھا گیا۔ سفید دیو اور ارژنگ دیو اور شیراسپ، گستاسپ، جاماسپ، مہراسپ، ارجاسپ، اسفندیار۔ "رستم رہا نہیں یہ نہ بہرام رہ گیا۔"

بڑی سخت نیند آرہی ہے۔

اے خسرو زمانہ بکشاد چشم و بنگر۔ در نامہ سکندر احوال ملک دارا۔

رات تیزی سے گزر رہی ہے۔ ٹھنڈ بڑھتی جارہی ہے بروایں دام بہ مرغ دگر نہ۔ کہ عنقارا بلند است آشیانہ۔ ہفت خواں کے بعد کیا ہوتا ہے؟ بڑی سخت نیند۔

بالکنی کے سفید پردے سرسراتے۔ ایک مختصر سی شے نے اندر جھانکا

"ہلو۔"

"ہلو۔" میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور گھبرا کر جواب دیا۔ ایک عجیب و غریب پرند پھدک کر سامنے آگیا۔

"مجھے آقائے سیمرغ نے بھیجا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟" پرندے نے پھڑپھڑا کر کہا۔

"آقائے.... کون ہے؟" میں نے گڑبڑا کر پوچھا۔

"خانم۔ آپ ابھی انہیں یاد فرما رہی تھیں۔" پرند نے ذرا بُرا مان کر کہا۔

"اوہ۔"

"موصوف خود نہ آسکے کہ پرِ دتوکول مانع ہے کیونکہ آپ نے بال کو۔"

"آگ نہ دکھائی۔" میں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

وہ حیرت انگیز پرند اچک کر ٹیلی ویژن پر بیٹھ گیا اور نہایت اخلاق سے گویا ہوا۔

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانہ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست

ہربرٹ ریڈ اکر میں نے ذہن پر زور ڈالا اور مناسب جواب دینا چاہا:

خیر مقدم مرحبا اے طائرِ میموں قدم

دوسرا مصرع یاد نہ آیا لہٰذا اس کے بعد "السلام علیکم"، پر اکتفا کی۔

"وعلیکم السلام۔" پرندے نے تقریباً علیگڈھ کے لہجے میں ڈپٹ کر جواب دیا۔

"معاف کیجیے گا۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں ذرا متعجب نظر آ رہی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ جیسا پرندہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"خانم! آپ بجا فرماتی ہیں۔ خاکسار عنقا ہے۔"

آقائے عنقا اب تازہ فارسی رسالوں کے انبار پر فروکش تھے۔ اچانک اپنے پنجوں کے نیچے ایک رنگین تصویر پر ان کی نظر پڑی اور وہ فوراً پھدک کر کاشانی قالین پر آ گئے اور اٹنشن کھڑے ہو گئے کہ وہ شاہ کی تازہ ترین تصویر تھی۔

اس محیر العقول صورتِ حال کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔

"آپ کو معلوم ہے آقائے عنقا کہ عین اس لمحے ماوراء النہر کے ادھر کیا ہو رہا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" عنقا نے پینترا بدل کے اب ٹیلویژن کا رخ کیا جس پر ایک اور عجمی زمزمہ سنج تھا۔

"اس پار۔" میں نے دریچے میں جا کر سلسلۂ کوہ کی طرف اشارہ کیا۔

عین اس وقت سلطانیٔ جمہور کا جشن تاسیس منایا جا رہا ہے۔"

"آپ کے آئینۂ اسکندر کا حجم بہت مختصر ہے۔" عنقا نے چالاکی سے میری سُنی ان سُنی کر کے کہا۔" ارباب حل کو تلقین کیجیے کہ آپ کے حجرے میں دوسرا آئینہ لگا دیں۔"

میں اس مسخرے پرند کو کہاں بخشنے والی تھی، اپنی بات پر اڑی رہی۔

"نغمۂ بیداریٔ جمہور، کابلستان، زابلستان، مازندران۔ آذر بائی جان، سب جگہ دیکھ لیجیے گا بہت جلد۔ جس طرح داغستان، کرغستان، قزاقستان۔"

"اور ہندوستان و پاکستان؟" عنقا نے چالاکی سے پوچھا۔

"گلستان بوستان۔" میں نے فوراً بات ٹالی۔

"سبحان اللہ! ماشاء اللہ!" عنقا نے جواب دیا

"ساری اولاد آدم۔" میں نے خطیبانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

"آقائے آدم نے تو جوٹ ملیں قائم کر لی ہیں اور ادبی انعام دیتے ہیں"
عنقا نے بات کاٹی۔

"کس قدر بے تکا پرند ہے۔"

"آپ کبھی اڑ کر اس طرف تشریف لے گئے ہیں؟"

"کدھر؟" اس نے تجاہلِ عارفانہ سے دریافت کیا۔

شمال میں آپ کا ایک پڑوسی ملک ہے۔ عجائب زر نگار ایسا خطہ کہ مرقع خیال مانی و بہزاد نے نہ کھینچا ہوگا اور پیر دہقان فلک نے مزرع عالم میں نہ دیکھا یعنی لال دیو کا دیس۔"

"تم نے فغفورِ چین کا تازہ بیان پڑھا؟" عنقا نے جواباً استفسار کیا۔

"آقا پہلے میرے سوال کا جواب عطا ہو۔"

"یاجوج ماجوج کا۔" عنقا نے ٹیلی ویژن کا بٹن گھماتے ہوئے جواب دیا
"سدِ باب ہو چکا ہے۔"

"بذریعہ انقلاب سپید؟"

"بالے۔"

"مگر آپ کو یاد ہے اے طائر لاہوتی کہ اس ملک میں جہاں آج عوج بن عنق نے بقیہ سفید دیوؤں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے وہاں دو صد سال قبل ایک انقلاب آیا تھا اور۔"

"عوج بن عنق؟" پرند نے پنجہ اٹھا کر ذرا سر کھجایا۔ "مے دی! موسیو دی گال۔" پھر وہ پھدک پھدک کر خوب ہنسا۔

"بالے۔" میں نے کہا۔ "ابھی وہی انقلاب بہت سے ملکوں میں آنا باقی ہے۔ اکتوبر والا تو دور رہا۔"

"تازیوں کے متعلق خانم آپ کیا کہتی ہیں؟" عنقا نے ایک چوکس صحافی کی طرح بات کا رخ پلٹا۔

"آپ لوگوں نے۔" مجھے غصہ آگیا۔ "محض لبغضِ معاویہ میں کاتے وجال کے ڈاکو ملک کو تسلیم کر لیا ہے۔"

وہ جاناںِ تتاری یعنی وارثانِ دولتِ عثمان بھی تو اس کے وجود کو قبول کر چکے ہیں۔ اور خانم! آپ شاہِ دقیانوس کے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔

آج کا اخبار دیکھیے۔" اس نے چوبخ میں تازہ اطلاعات اٹھا کر مجھے پیش کیا۔
"جنگِ شدید مصر و اسرائیل۔ شہر سویز در میان شعلہ ہائے آتش می سوزد۔"
"میں پڑھ چکی ہوں۔"
"جی نہیں۔ اندر کا جوشیلا ایڈیٹوریل پڑھیے۔"
میں نے اخبار کھولا۔
"خانم۔" عنقا نے سنجیدگی سے کہا۔" مسلمان ہمیشہ مسلمان کا ساتھ دے گا تازیوں کے ان مصائب پر ہم خون کے آنسو رو رہے ہیں۔" پھر اس نے دوسری چینل لگائی۔ اسکرین پر دفعتاً تاج شاہی کا کلوز اپ جگمگانے لگا۔ عنقا مسحور سا ہو کر پھر اٹنشن کھڑا ہو گیا۔"
"موسیو! قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تک؟" میں نے کہا۔
"مادموزیل۔ آپ کی روشنیٔ بصر کے لئے۔" اس نے پلٹ کر جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔" سرمے کی ضرورت ہے حکیم طوسی کو یاد کیجیے۔"
میں نے کیا تھا انہیں ٹلفن۔ معلوم ہوا کہ ٹیلز کے لئے منسٹری آف کلچر گئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ان کا تلویزیون پر پروگرام ہے۔ حیف کہ آپ لوگ بھی شمع تلویزیوں کے پروانے۔"
"خانم!" عنقا نے بات کاٹی۔" ہمارے جام جم کو آوٹ آف فوکس ہوتے صدیاں گزر چکی ہیں۔ کیوں نہ ہم اب ساحرِ فرنگ کے عجائب ادھو، ہو ذرا یہ نظارہ دیکھیے۔" عنقا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اسکرین پر اب شہر کی قیامت خیز آئینہ بندی اور چراغاں کے مناظر دکھاتے جا رہے

تھے۔ خوش پوش عوام کے ہجوم۔ مسرور چہرے، موٹروں کا سیلاب۔ اچانک کیمرہ حکیم فردوسی کے بلند و بالا مجسمے پر آکر تھم گیا۔ سنگی قبا میں ملبوس، ہاتھ میں شاہنامہ تھامے روشنی میں نہائے ہوئے فردوسی دیدہ ور اپنی فرحاں قوم کو کیسی متبسّم نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پس منظر میں سرود بجنے لگا۔

یک بیک عنقا نے پر پھیلا کر ایک سانس میں کہنا شروع کیا۔

برفت از در پردہ سالار بار ؎

بیامد خراماں بر شہریار!

بگفتش کہ رامشگرے بر در است

آیا بربط مغز رامشگر است

ہمی راستے جوید بدیں پیش گاہ

چہ فرماں دہد نامور بادشاہ

بربط چو بالست بر ساخت زود

برآورد ماژند رانی سرود

اور پھر خاموش ہو گیا۔ مجھ پر نظر ڈالی، میری جہالت پر افسوس کرتے ہوئے توضیحاً کہا، "یہ شاہ کیکاؤس کے جشن تاجگذاری کا ذکر تھا۔"

اب اسکرین پر دوبارہ تاج شاہی اور اس کے بعد بانک ملّی میں محفوظ زر و جواہر کے کلوزاپ آن موجود ہوتے اور لعلِ بدخشاں اور الماس کے جڑاؤ ظروف اور جام۔

؎ "روشن ہے جامِ جمشید اب تک۔ شاہی نہیں ہے بے شیشہ بازی۔"

میں نے فوراً کہا "اشعار تھے کہ اس عجمی پرند کی موجودگی میں نوائے سروش کی طرح چلے آرہے تھے۔"

"اے خانم خارجی!" عنقا نے بڑی طرح جھلا کر جواب دیا "آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کجکلاہ عجم سوشلسٹ ہو گئے ہیں۔"

"جھکی پرندہ ہے۔" میں نے سوچا اور واپس آکر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

اب آقائے پتہ نہیں کون ایک گلشن میں سرود بجاتے چلے جا رہے تھے عنقا نغمے میں محو ہو گیا۔

"آقائے عنقا۔" چند منٹ بعد میں نے جماہی لے کر کہا۔ "نیند کے مارے میری حالت خراب ہے۔ صبح بہت سویرے اٹھنا ہے۔ ابھی پریس روم سے کل کے متعلق تازہ بلیٹن بھی نہیں آیا۔ آپ کو علم ہے کل شاہ کا کیا پروگرام ہے؟"

"شہنشاہ آریا مہر کہیے۔" عنقا نے ڈپٹ کر جواب دیا۔ میں نے اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ "شہنشاہ آریا مہر۔ شہنشاہ آریا مہر۔"

"یہ آریا مہر کیا شے ہے آقا؟" میں نے سوال کیا۔ "اڈولف ہٹلر کی آریا نسل۔ پنجاب کا آریا سماج۔ بھلا غور کیجیے۔ ایک اصطلاح کتنے مختلف معانی رکھتی ہے۔ خود "آریا نسل" ایک بے حد مبہم اصطلاح ہے۔ اینتھروپولوجی۔"

اب عنقا نے منقار وا کر کے جماہی لی مگر میں کہے گئی۔ "اور اینتھروپولوجی کی رو سے ایران میں منگول یعنی ترک جنوب میں نیگرو اور مجموعی طور پر کاکیشن نسلیں آباد ہیں۔"

"اسی لئے کوہ قاف کی پریاں کہا جاتا ہے۔ ہم ایرانی ایک بے حد خوبصورت قوم ہیں۔" عنقا نے پر پھیلا کر کہا۔

"درست! اور برطانوی ہند میں "نیٹو" سے یوروپین کو اسی لفظ کاکیشن سے ممیز کیا جاتا ہے جبکہ انگریز بہادر نے آپ ایرانیوں کو بھی "نیٹو" کہتا تھا۔"

عنقا سوچتا رہا۔

"اچھا! مثال کے طور پر اس فقیر حقیر کو لیجیے جو اس وقت کوہ دماوند کے سائے میں موجود ہے۔ میں کیا ہوں؟"

"کافر ہندی۔" عنقا نے مختصراً جواب دیا۔

"آقائے عنقا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔" مجھ خاکسار کے نسلی اجزائے ترکیبی کا تجزیہ فرمائیے۔ میں سامی النسل ہوں یا آریا؟"

"نمی دانم۔"

"سنیے! یہ فدویہ بنی ہاشم ہے۔"

"تازی۔" عنقا نے ذرا منہ لٹکا کر کہا۔

"اور جناب شہر بانو خالص ایرانی تھیں تو اس لحاظ سے ناچیز تھوڑی سی آریا بھی ہوئی؟"

عنقا خوش نظر آیا۔

میری نسلی، تہذیبی اور روحانی جڑیں ارضِ عجم و عرب میں بے حد گہری ہیں۔"

"بالے! لیکن پچھلے آٹھ سو سال سے آپ انڈک سوسائٹی

میں شامل ہیں۔" عنقا بولا، "وہ اپنے ٹوئینبی (INDIC SOCIETY) (TOYNBEE) سے بخوبی واقف تھا۔

"انڈک اسلامک سوسائٹی۔" میں نے تصحیح کی۔ "تو ذرا بتلایئے کہ یہ سب کیا گھپلا ہے؟ قوم۔ نسل، تہذیب کی بھول بھلیاں۔"

"پچھلے چھ ہزار سال سے۔" عنقا نے جواب دیا۔ "میں کوہ دماوند کی چٹانوں میں چھپا اس گھپلے کا نظارہ کر رہا ہوں جس میں مبتلا ہو کر فانی انسان ایک دوسرے کو نیست و نابود کرتے رہے ہیں۔"

یک بیک عنقا نے پر پھیلا کر ایک سانس میں کہنا شروع کیا۔ "برفت از در پردہ سالار یار۔ بیامد خراماں بر شہریار، بگفتش کہ رامشگرے بر دراست۔"

مجھے نیند کا ایک اور جھونکا آیا۔ عنقا بولے جا رہا تھا۔ "چہ فرماں دہد نامور بادشاہ۔" اور "برآورد ماشد تدرانی سرود۔"

"میں شاہ نامہ فردوسی سنا رہا تھا اور آپ سو رہی ہیں۔ ملک الشعرا فرخی سناؤں؟ داغ گاہ شہر یار اکنوں چناں خرم شود۔" اچانک عنقا فرخی کو بھول کر وہ تلویزیون (ٹیلی ویژن) کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔ تلویزیون میں اس کی یہ دلچسپی حیرت انگیز تھی۔ پروگرام ختم ہوا۔ قومی ترانہ بجا۔ عنقا اٹنشن کھڑا ہو گیا۔

"تلویزیون" میں نے چڑ کر کہا۔ "پس ماندہ اقوامِ مشرق کا نیا STATUS SYMBOL ہے۔"

"ہم۔" عنقا نے وقار کے ساتھ گردن اٹھا کر کہا: "اب پس ماندہ

نہیں ہیں۔ اب ہم خاور میانہ کا جاپان بننے والے ہیں۔" پھر وہ پھدک کر بالکنی میں چلا گیا۔ "دوبارہ حاضر ہوں گا۔ شب بخیر۔" اس نے وہیں سے آواز دی اور پھر سے اڑ گیا۔

اس قدر قوم پرست پرندیں سنے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

مطربِ خوش نوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو
بادۂ دلکشا بجو تازہ بہ تازہ نو بہ نو!

نگارندہ داستان یوں لکھتا ہے: پھر ماجرائے غریب کہ ہوا پیمائے ایران تھا جب صبح سویرے فرودگاہ مہرآباد پر پَر فشاں ہوا۔ اس وقت کوہ دماوند کی چوٹی ابر میں پوشیدہ تھی اور فضا پر وہ خنکیِ جانفزا طاری تھی جس کے باعث لالہ زار عجم مینو سواد بہشت نژاد مشہور ہے۔ پایۂ تخت اس اقلیم کا پسند خاطر محبوبانِ جہاں قابل بود و باشِ خوبانِ زماں، شمیم اس کی دافع خفقان و خلجان۔ زمین اس کی رشک فردوس۔ گلی کوچہ خجلت دہ باغ ارم۔ مرد و زن بے آزار و خوش اطوار۔ راستے تمام مصفیٰ و ہموار۔ دکانیں و مکانات نفیس بطرز فرنگ۔ خلقِ خدا باخاطر شاد۔ دولت و روغن معدنی وافر لیکن بہ ایں حکومت و ثروت پادشاہ اولاد نرینہ نہ رکھتا تھا اور لشب و روز مع بی بی و رعایا دستِ بدعا رہتا تھا کہ ع

الٰہی غنچۂ امید بکشائی

تمنا اس کی آخر جناب باری سے پوری ہوئی۔ بعد اس واقعہ روح افزا کے تاجدار فیروز بخت نے قصد کیا کہ جب رعایا اوس کی خوش حال ہو جاوے

تب تاج شاہی زیبِ فرق کرے۔ القصہ آشیانہ مہرآباد ہوا جس پر آن کے اترا آراستہ مثلِ عروسِ نو کے تھا۔ ہر چہار جانب تصاویر دودمانِ شاہی، قالین ہائے نظر فریب و گلہائے صد رنگ۔ زنان ایرانی مثل حوران فرنگ ۔ جوانانِ خوبرو مثلِ صاحب لوگ۔ بازار راستے گل پوش۔ درفش کاویانی جابجا سربلند۔ عساکر قواعد پریڈ میں مشغول۔ وردیوں پر طلائی ڈوریوں اور تمغہ جات کی فراوانی۔ حتیٰ کہ چوراہے کا سپاہی اچھا خاصا جرنیل معلوم ہوتا تھا۔ گمان ہوا عہد ہیپس برگ کا کوئی اوپیرا ہے۔ گرم کوٹ پتلون، بوٹ، موزے اور ہیٹ پہنے مزدور۔ وسیع باغات، مہذب منظم ہجوم، شوروغوغا، فلمی گانوں، غلاظت اور بھکاریوں کا فقدان۔ سڑکوں پر دورویہ صنوبر و شمشاد کی قطاریں جس سے جگر لالہ میں پیدا ہو وہ ٹھنڈک، افق پر بھورے کوہسار

تہران کے نواحی پہاڑوں کا یہ سلسلہ شمران تک پھیلا ہوا ہے جہاں

جہاں چودہ منزلہ رویال ہلٹون ہوٹل ایک سرسبز ٹیلے پر استادہ ہے۔ طویل سایہ دار شاہراہ پہلوی تہران کو شمران سے منسلک کرتی ہے۔ ہلٹون کی برساتی میں دربان قدیم ایرانی پوشاک میں ملبوس کہ مشرق کی ساری تاریخ اب ٹورسٹ انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہوٹل کے اندر چار سو مغربی نامہ نگار اور متعدد جغادری وی۔ آئی۔ پی لوگ آچکے ہیں۔

چودھویں منزل پر میرے کمرے کے سامنے شمران کی ڈھلان پر امرا کی کوٹھیاں دور دور تک بکھری ہوئی ہیں اور ان کے صحنوں میں تیز نیلے پانی کے سوئمنگ پول جھلملاتے ہیں۔ سردیوں میں یہ سارا منظر برف پوش

ہوگا۔ بہار میں یہاں نغمۂ ہزار گونجے گا۔

گراؤنڈ فلور کی "کافی شاپ" اور ایوانِ طعام میں لوگ باگ گرم گرم تاس اور ششلک کباب اور سرد تربوز اور ملائی جیسے نفیس گیلانی چاول کا پلاؤ نوش کرنے میں مصروف ہیں۔ دریچوں کے باہر نیلے دھندلکے میں تہران افق تا افق پھیلا ہوا ہے۔ ایک دریچے کے نیچے ایک بمبئی نژاد وسیع و عریض پارسی خاتون زرق برق ساری پہنے جنگی جہاز کی طرح تیرتی اکثر آکر ہماری میز پر بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ مارشنس آف ونچسٹر ہیں جنہوں نے چند سال قبل برطانیہ کے سب سے اعلیٰ مرتبت اسی سالہ مارکوئس آف ونچسٹر سے شادی رچائی تھی۔ بقول خود مارشنس صاحبہ رضا شاہ کبیر کی ذاتی دوست تھیں

شام کو سارا شہر پرستان میں تبدیل ہوگیا۔ پہاڑ کی چوٹیوں، مکانوں اور سڑکوں پر ان گنت لمنوں کے برقی تاج۔ پتہ پتہ بوٹا بوٹا۔ لاکھوں برقی قمقموں سے منور۔ تہران پلیس ہوٹل میں وزیر اطلاعات آقائے جاوید منصور بیرونی صحافیوں سے ملاقی ہیں۔ صبح کے کارونیشن بلیٹن میں جو روز ہلٹن کے پریس روم سے جاری ہوکر ہر صحافی کے کمرے پر پہنچ جاتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ تقریب میں شامل ہونے والے تمام حضرات کے لئے لباس تیرہ یعنی سیاہ ٹیل کوٹ (یورپ کا درباری لباس) اور خواتین کے لئے لمبے گاؤن، لمبے دستانے اور ہیٹ لازم ہیں۔

"میرا نام سلویا متحسن ہے۔" آقائے جاوید منصور کی دعوت میں ایک متفکر بی بی نے مجھ سے کہا تھا۔ "میں لندن ٹائمز کے لئے تصویریں

کھینچ رہی ہوں۔ دستانے پہن کر تصویریں کیسے کھینچوں گی؛ کیا تم بھی ساری کے ساتھ ہیٹ اور دستانے پہنو گی؟"

اس سارے بین الاقوامی مجمع میں اتفاق سے ساری پوش خاتون صرف میں ہوں۔

"نہیں! میں ساری کے ساتھ ہیٹ اور دستانے نہیں پہنوں گی۔" میں نے جواب دیا۔ بوکھلائی ہوئی مسز میتھسن لاتف کی فوٹوگرافر میری لن سلواسٹون کی طرف لپکیں۔ میری لن حسب عادت سکون سے مسکرائی (میری لن اب بدھ ازم کی طرف راغب ہو چکی ہے)۔

ایک فرانسیسی نما خاتم ہم لوگوں کی طرف آئیں۔ وہ پریس کارڈ تقسیم کر رہی تھیں۔

"متشکرم۔" میں نے کارڈ لے کر کہا:

انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا فرمایا "آپ کی زبان تو سنسکرت ہوگی؟" پھر میرا نام پڑھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر بولیں "آپ انڈیا سے آئی ہیں؟"

"جی ہاں! وہاں ابھی اس قسم کے نام والے لوگ کئی کروڑ بستے ہیں" الخ اخلاق سے مسکرائیں مگر ان کا کنفیوژن کم ہوتا نظر نہ آیا۔ میں نے اس تصویر پر غور کیا۔ ساری کے ساتھ دستانے اور ہیٹ اور زبان سنسکرت۔

(میری لین اس سارے کنفیوژن کا علاج آج کل سکم کی ایک بدھسٹ خانقاہ میں تلاش کرنے میں مصروف ہے۔)

طہران ۔ جسے اب اہل ایران تہران لکھتے ہیں کہ ط عربی حرف ہے ۔
سطح سمندر سے پونے چار ہزار فیٹ کی بلندی پر البرز کے دامن میں واقع ہے ۔ ناصری نے لکھا ہے کہ طہران اور شمران دو گاؤں ہیں ۔ منگولوں کے ہاتھوں رے کی تباہی کے بعد وہاں کے باشندوں کو ان گاؤں والوں نے خوش آمدید کہا ۔ سولہویں صدی میں طہماسپ صفوی نے قزوین کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا ۔ وہ روضہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی زیارت کے لئے جاتے ہوئے طہران سے گزرا ، جگہ پسند آئی ۔ یہاں قلعے بنوا کر ان کی دیواروں پر آیاتِ قرآنی نقش کروائیں ۔ فصیل میں چودہ پھاٹک تھے ۔

۱۷۸۸ء میں شاہانِ قاچار نے طہران کو اپنا دارالحکومت قرار دیا ۔ بارہ محلے آباد تھے اور شہر گلستانوں اور پھلوں کے باغات سے پُر تھا ۔ صحن چمن ز لالہ و ریحان مزیں است گلہا شگفتہ در چمنستان بصد سرور ۔ قمری بشاخ سرو با آہنگ دلربا وغیرہ وغیرہ ۔

شاہانِ قاچار کے بنوائے ہوئے کاخِ گلستاں میں مراسمِ تاج گذاری کی ریہرسل کی جا رہی ہے ۔ دربار ہال میں کاریگر اور اہل کار مصروف کار سامنے تختِ طاؤس رکھا تھا ۔ میں نے قریب جاکر اسے بہت آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ۔ سنہری پشت اور ستھوں اور پایوں پر فارسی اشعار کندہ تھے ۔ محمد شاہ رنگیلے اس پر آخری بار جب بیٹھ کر اٹھے ہوں گے ان کو کیا معلوم تھا ۔ میں نے پرس سے کاغذ نکال کر اشعار بسرعت نقل کئے ۔ مغربی نامہ نگار ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے ۔ کسی نے مجھ سے کہا :" اصل

تختِ طاؤس بانکِ ملی میں محفوظ ہے۔ یہ اس کی نقل ہے۔" واللہ اعلم بالصواب۔

باہر خدام شاہی سامان آرائش اٹھائے چلے آرہے تھے۔ مجھے لکھنو کے امام باڑوں کا سادو سامان یاد آگیا۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہانِ اودھ تے کہ خود خراسانی النسل تھے۔ ایک ایک چیز میں شاہانِ ایران کی نقل کی تھی۔

رات کو منسٹری آف کلچر کے ایک ہال میں شاہی خاندان کے متعلق ڈوکومنٹری فلم دکھائی جارہی تھی۔ ایک ہال میں دیہی نوربافت اپنے کرگھوں پر بیٹھے دیبا و حریر لاتے بیٹھے ہیں۔ وزیر اطلاعات نے ایک ایک میزپوش تمام غیر ملکیوں اور صحافیوں کو پیش کیا۔

"فنٹاسٹک۔ فنٹاسٹک۔" ایک امریکن خاتون میز پوش کے گل بوٹوں پر ہاتھ پھیر کر دہراتے جارہی تھی۔ ایک انگریز صحافی ڈیوڈ، اس کی امریکن بیوی برینڈا اور ایک انگریز نامہ نگار لڑکی ایلین اندر سے نکلے میں باہر ایک مرمریں ستون کے نیچے بیٹھی صحن بوستان کو ملاحظہ کر رہی تھی جس کے گل بوٹوں سے ایران کے شعراء اور ہنرمندوں اور مصوروں نے اپنے شہ پاروں کو سجایا۔ ایران کا لینڈ اسکیپ اس کی روح کا لینڈ اسکیپ ہے۔

فنٹاسٹک۔ فنٹاسٹک۔

.. ایلین اور برینڈا اپنی منی اسکرٹوں کے اوپر فرکوٹ پہنے آکر سیڑھیوں

پر چپ چاپ بیٹھ گئیں - یہ منی اسکرٹ کے عروج کا زمانہ ہے۔ تعجب ہے یہ لوگ اتنی سردی میں ٹھٹھر کیوں نہیں جاتیں۔

فنٹاسٹک۔

ڈیوڈ برینڈا اور ایلین ہوٹل میں میری فلور پر مقیم ہیں۔ دوسرے روز صبح بہت روشن تھی۔ ڈیوڈ اور برینڈا کے کمرے میں پستہ سے شغل کیا جارہا تھا جو اہل ایران مونگ پھلی کی طرح کھاتے ہیں۔ کمرے کا رخ پائیں باغ کی طرف تھا۔ اچانک نیچے سبزے پر یہ سر کھولے ہوئے قاف سے پریاں اتر آئیں۔ کشور ایران کے مختلف صوبوں کے فوک ڈانسر مرد اور عورتیں اپنی اپنی علاقائی پوشاکوں میں ملبوس جشن تاج گذاری کے لئے ریہرسل میں مصروف ہوئے۔ اوپر روشن نیلے آسمان پر فضائی مظاہرے کی مشق کے لئے جیٹ طیارے کے پرے سرمئی بادلوں کی طرح گذر رہے تھے۔

ہلٹن کے سبزہ زار پر کُرد اور آذر بائیجانی ترک رقصاں۔ مہوشے ترک قباپوش اور چنے کیا۔ زہر گوشہ میرفت جوں موج موج۔

ٹیلفون کی گھنٹی بجی۔ ایلین اٹھ کر گئی۔ آکر کہا۔ تمہارے ہم وطن پیتر کار پوچھ رہے ہیں۔ "شام کو آپ لوگ نائٹ کلب چلئے گا؟"

رات کے وقت ہم وطن پیتر کار شگوفہ نائٹ کلب میں بہت ہشاش بشاش کیبرے ملاحظہ کرتے نظر آئے۔

دھن اور رقاص تبدیل ہوتے۔ الف لیلوی پوشاک میں ایک

لڑکے اور لڑکی نے "جنگلی" کا مشہور گیت "میری جاں شب بخیر" گا کر ناچنا شروع کیا۔ ڈیوڈ، برینڈا اور ایلن بہت مسحور نظر آئے۔ میں نے اس وقت انہیں بتانا مناسب سمجھا کہ یہ ایک انڈین فلمی گیت ہے۔

ہم وطن پترکار خوشی سے بے حال تھے۔ میں بحیثیت ان کی شیپرون ان کی حرکات و سکنات کو نظر میں رکھنا چاہ رہی تھی۔ یہ مشرقی ہند کے ایک بھولے سے معمر صحافی تھے۔ بمبئی ایئر پورٹ پر ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا آپ بھی ہمسفر ہیں۔ ان کی بے حد کم عمر بیوی نے بڑی لجاجت کے ساتھ چپکے سے کہا تھا: "دیدی یہ بہت سیدھے ہیں اور پہلی بار باہر جا رہے ہیں۔ ذرا ان کا خیال رکھئے گا۔" ان مہذب بزرگ صحافی نے بھی مجھے دیدی کہنا شروع کر دیا تھا۔

جب فضائی لڑکی نے شراب پیش کی آپ نے پینا شروع کر دیا۔ وہ مجھ سے بہت آگے بیٹھے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار اشارے سے منع کیا مگر اب وہ "فارن ٹریول" میں مصروف تھے کس کی سنتے۔ طہران پہنچنے سے ذرا قبل ایرانی لڑکی نے شراب کا بل پیش کیا تو گھبراتے ہوئے میرے پاس آئے۔ "دیدی گجب ہو گیا۔ یہ چھوکری ہمارا دیوالیہ نکال دیا۔ ہمارا سارا فارن ایکس چینج ختم ہو جائے گا۔ ہمارا خیال تھا شراب بھی مفت ہے۔"

"میں نے بار بار آپ کو منع کیا۔ آپ نے اس وقت کیوں نہیں سنا؟"

پترکار نے بہت توبہ تلا کی۔" اب آپ کی بات ہمیشہ ضرور

مانے گا۔ ڈیڈی ہمارا ابی بی کو مت بولنا۔"

اس وقت وہ شگوفہ نائٹ کلب میں بالکل پرستان میں پہنچے ہوئے تھے لہٰذا میری نظریں بچا کر ایک دور کی میز پر جا بیٹھے۔

میری جان شب بخیر کے بعد خانم جمیلہ بیلی ڈانسر تشریف لائیں۔ میرا خیال ہے مشرق وسطیٰ کی یہ بیلی ڈانسر حمقاء کو فوراً تاڑ لیتے ہیں۔ ناچ کے بعد اسٹیج سے اتر کر ٹکتی ٹکتی وہ سیدھی پترکار کی میز کی سمت گئی اور جا کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

اب رات کا ایک بج رہا تھا۔ "ہمیں صبح چھ بجے شیراز کے لئے پرواز کرنا ہے۔ اب چلنا چاہیئے۔" میں نے ایرانی میزبان سے کہا۔

پترکار دوڑتے ہوئے آئے، بولے "آپ چاروں کے ایر ٹکٹ متعلقہ افسر نے آج دوپہر مجھے دے دیئے تھے۔ میں ٹھیک صبح ساڑھے چار بجے ہلٹن کی لوبی میں آپ سے ملوں گا۔" وہ خود کسی دوسرے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔

"بہت خوب! اب آپ بھی اپنی قیام گاہ واپس جایئے فوراً۔" میں نے جواب دیا۔

"ڈیڈی آپ باہر چلئے ہم کلوک روم سے اپنا اوور کوٹ لے کر آتا ہے۔"

نائٹ کلب سے باہر آ کر ہم پترکار کے انتظار میں مصروف ہو گئے اس وقت سڑک بالکل سنسان ہو چکی تھی۔ کہرہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم لوگ

ڈیوڈ، برینڈا، ایلن، ایرانی میزبان (جو ایک درباری افسر تھا) اور اس کی لڑکی ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے پیٹر کار کی راہ دیکھ رہے تھے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ ایرانی میزبان اس دوران میں ان کو کلب میں تلاش کر آئے مگر وہ نہ ملے۔ "پولیس کو اطلاع کر دیجیے۔" میں نے غصے سے کہا اور ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ منسٹری آف کلچر کی لموزین بڑھا کر آگے لے آیا۔ ہم لوگ ہوٹل واپس پہنچے۔

اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے، ڈیوڈ برینڈا اور ایلن کے ٹکٹ پیٹر کار کے پاس ہیں۔ میں نے گھبرا کر ایلن کو فون کیا۔ اس نے گھبرا کر پیٹر کار کے ہوٹل فون کیا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ موصوف ابھی واپس نہیں آئے۔

صبح ساڑھے چار بجے سے چالیس مغربی اخبار نویس مرد اور عورات اپنے اپنے کمروں سے اتر کر ہوٹل کی لوبی میں جمع ہو رہے تھے۔ پیٹر کار ندارد۔ پانچ بجے منسٹری آف کلچر کا افسر جو ہمارے ساتھ شیراز و اصفہان جا رہا تھا کوچ لے کر آگیا۔ اس نے کہا آپ چاروں کے لئے ایرپورٹ سے دوسرے ٹکٹ لے لئے جائیں گے مگر مجھے ان صاحب کے متعلق بڑا تردد ہے کہاں چلے گئے؟

ٹھیک پانچ بجے کوچ ہلٹن کی ڈھلوان سے اتر رہی تھی کہ پیٹر کار ٹیکسی میں آتے دکھائی دیئے۔ کوچ روک کر ان کو سوار کیا گیا۔ ایرپورٹ

پہنچ کر وہ میرے قریب آئے۔ شکل پر گھڑوں ندامت برس رہی تھی۔ انتہائی مسکینی سے کہا: "دیدی ہم کو معافی دیو۔ ہم کلوک روم سے باہر آرہا تھا خالم جمیلے سے پھر مل گیا۔ اس کو ہم بولا تھا مڈل ایسٹ کی نائٹ لائف کے بارے میں ایک آرٹیکل اپنے پیپر پر لکھنا مانگتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک اور نائٹ کلب لے گیا۔ وہ شگوفہ سے بھی جیاستی بڑھیا تھا مگر دیدی پلیز ہمارا بی بی کو مت بولنا۔"

موصوف پر خفا ہونا بے کار تھا۔ لاعلاج تھے۔ نرمی سے دریافت کیا خالم جمیلے کون؟

"وہی ترکی۔ "بہت ڈلیسنٹ عورت تھا۔"

فرودگاہِ شیراز کے سامنے گلاب کے تختے لہلہا رہے ہیں۔ ایلین کار میں بیٹھتے ہوئے دفعتاً بولی:

"یہ جگہ۔ بالکل یہی جگہ، یہی فضائیں میں سال بھر پہلے خواب میں دیکھ چکی ہوں۔ یہی کار۔ یہی لوگ۔"

"ایلین۔" میں نے رسانیت سے جواب دیا۔ "بہتر کار نے اپنے حُمق سے ناک میں دم رکھا ہے۔ اب اسی کی کسر ہے کہ تم ۔۔۔ ہو جاؤ۔"

کاریں ایک قطار میں شہر سے باہر مزارِ حافظؒ کی سمت روانہ ہوئیں۔

السلام علیکم حافظ جی۔" میں نے دل میں کہا۔ ان اہلِ مغرب کو جو ساتھ جا رہے ہیں کیا پتہ کہاں جا رہے ہیں کہ درآں جا خبر از جلوہ ذاتم دارم۔

روضۂ حافظ میں سرو شمشاد کے کُنج ۔ میوزیم چار خانہ ۔ پہلی بار پترکار نے ایک معقول بات کہی بولے "یہاں چار خانہ کی بجائے میخانہ ہونا چاہیے تھا" پترکار پڑھے لکھے انسان تھے ۔ ویدانت سے بھی علاقہ رکھتے تھے ۔ خدا تعالےٰ کے اصلی سادہ دل بندے ۔

ایک دراز قد فوجی افسر اور اس کی خانم گلشنِ حافظؒ کے باہر سنسان سڑک پر سے اپنے بچے کی پریم گاڑی دھکیلتے چمنستان میں داخل ہوئیں ۔ مزار خواجہ کے پاس پہنچ کر پریم ایک طرف کھڑی کی ۔ تربت پر ہاتھ ٹکا کر فاتحہ پڑھی ۔ خاموشی سے واپس چلے گئے ۔

پترکار بہت متاثر نظر آرہے تھے ۔ اس وقت میں نے ان کی تمام بیوقوفیوں کو معاف کر دیا ۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے ۔ "دیدی حافظؒ کے کوئی میخانے والے شعر سناؤ نا دیدی ۔"

"حافظ کی شراب کا مطلب آپ جانتے ہیں نا ؟" مجھے فکر تھی کہ یہاں سے ہوٹل شیراز پہنچ کر بار پر نہ جا بیٹھیں کہ حافظ کے شہر میں پیروی حافظ کر رہا ہوں ۔ فرمایا دیدی ! ہم کو معلوم ہے حافظ ہمیشہ پرماتما کے گیان کی بات بولتا تھا ۔ کچھ سناؤ نا ؟

میں نے دماغ پر بہت زور ڈالا ۔ چند شعر مع انگریزی ترجمہ گوش گزار کیے ۔

جریدہ رو کہ گذرگاہ عافیت تنگ ست

پیالہ گیر کہ عمر عزیز بے بدل ست

رستر خدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

اور سنیئے :-

حدیث از مطرب وے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

پیتر کار ایک صنوبر کے نیچے بیٹھ کر مراقبے میں چلے گئے۔ فرنگی اخبار نویس روضے میں مصروفِ گلگشت ہیں۔ اچھا ہے بے خبر رہیں۔

پچا سعدیؒ کے مقبرے کی اندرونی دیواروں پر جو اشعار کندہ ہیں لندن ٹائمز کا رپورٹر ان کو بغور دیکھ رہا ہے۔" یہ سب کیا لکھا ہے ؟" وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔

"گول کرو۔ اب تمہیں کون سمجھائے ؟"

کپلنگ ٹھیک کہہ گیا تھا۔ مغرب و مشرق کی روحیں جدا گانہ ہیں۔

ستاون میل دور پرسی پولس کو جانے والی شاہراہ۔ دونوں طرف خشک بنجر زمین پر چرواہے بکریاں لئے جا رہے ہیں۔ کار میں پچھلی سیٹ پر ایلن کے برابر ایک اطالوی جرنلسٹ آ بیٹھا تھا۔ ایلن نے چند منٹ بعد سرگوشی میں مجھ سے کہا " یہ عجیب سا آدمی ہے۔ میں اس

طرف بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

انگلستان کی PERMISSIVE سوسائٹی کی پروردہ۔ اونچی سے اونچی منی اسکرٹ پہننے والی ایلن ایک مشرقی لڑکی کی طرح گھبرا رہی تھی اس نے کسی بہانے پتر کار سے جگہ تبدیل کرلی۔ انہوں نے بعد میں مجھ سے کہا یہ انگریز لڑکی اتنا شریف ہے۔

"آپ لوگوں کے دماغ سے یہ خیال کب نکلے گا کہ مغرب کی ہر لڑکی آوارہ ہوتی ہے؟" میں نے جواب دیا۔

دور سے پرسی پولس کے سرخ کھنڈر نظر آتے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ہم سب محلات کے کھنڈروں میں بکھر گئے۔ مبہوت، مرعوب ہکا بکا دارائے بزرگ کے اس کاخ عظیم کو سکندر نے نذر آتش کردیا تھا کڑکا سکندر بجلی کی مانند۔ ایک ضربِ شمشیر افسانہ کوتاہ۔

تخت جمشید کے ایک چبوترے پر سے ایک خوانچہ فروش لڑکا گذر رہا تھا۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور اس کا خوانچہ فرش پر گر گیا۔ معمولی مٹھائیاں زمین پر بکھر گئیں۔ وہ بے اختیار رونے لگا۔ وہ روتا جاتا تھا اور بے بضاعت اثاثہ چنتا جاتا تھا جو خاک آلود ہونے کی وجہ سے کوئی نہ خریدے گا۔

میاں خوانچہ فروش تم کیوں روتے ہو یہاں پورا پرسی پولس تباہ ہوچکا تم چند ریال کے نقصان پر روتے ہو۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔

پترکار ٹہلتے ہوئے قریب آئے فرمایا کوئی با موقع شعر سناؤ نا دیدی۔"

"اے خسروِ زمانہ بکشاد چشم و بنگر
در نامۂ سکندر احوالِ ملکِ دارا"

میں نے جواب دیا۔
اور سینئے ؎

سرودِ مجلسِ جمشید گفتہ اند ایں بود
کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

اور سینئے ؎

بنائے کوئی عمارت تو کس توقع پر
پڑا ہے قصرِ فریدوں میں آدمی سونا

شیراز سے باسٹھ میل دور نقشِ رستم۔ پہاڑ کے اندر ترشے ہوئے مقابر
شاہان ہخامنشیہ وزیر جنیں۔ شہریار سے چناں۔ رستم رہاز میں پہ نہ بہرام رہ گیلہ
بیک چشم بر ہم زدن شد تباہ۔ چہ تاج و چہ تخت و چہ گنج و سپاہ۔ کدام است
جام جم و جم کجاست۔ یہاں کون کون ہستیاں مدفون ہیں۔ کسریٰ اول، دارائے
کبیر، داراتے سوئم۔ کسریٰ دوئم اور ایک چوکور سنگی عمارت کہ کعبۂ زرتشت
کہلاتی ہے۔

اور اب ہوٹل شیراز کے برآمدے میں لوگ باگ آرام کر رہے ہیں
سارے گورے اور میمیں آرام کرسیوں پر نیم دراز سرد و شیریں تربوز نوش
کرنے میں مصروف ہیں اور بیئر پی رہے ہیں۔

زاں بادہ کہ از جمِ دِکَے ماندہ یادگار
لبریز کن کہ چشم بداز عیشِ مابدور

ہوٹل کے باغ میں بلبل ہزار داستان نغمہ سرا ہے۔

خون کرد دردلم اثرِ آوازِ عندلیب
گشتم چنانکہ ہیچ نماندم تحملّے

شیراز سے واپسی پر راستے میں شہر کا قبرستان نظر آتا ہے۔ صد حیف کہ گلرخاں کفن پوش شدند۔

شیراز نہیں جانا چاہیئے۔

اصفہان نصف جہان۔ ہوٹل شاہ عباس۔ فویر کے وسطی فوارے میں دنیا بھر کے سکے پڑے ہوتے ہیں۔ جو بیرونی سیاح یہاں لاکر بطور شگون ڈالتے ہیں۔ تھری کوائنز ان اے فاؤنٹین۔ مرصع مصوّر سہری الف لیلوی مہمانسرا تے جسے عہد شاہ عباس بزرگ کی ایک کاروان سراتے کے قطعۂ زمین پر اسی انداز سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ایران جدید کا ٹورسٹ شو پیس نمبر ون۔ دیواریں قدِ آدم، ایرانی تصاویر سے مزیں۔ ہوٹل کیا ہے عہدِ صفویہ کا رفیع الشان شاہی محل ہے اور نگار خانہ مانی و بہزاد۔

مہمان سراتے کے خدام نے عہد صفویہ کی پوشاک پہن رکھی ہے۔ ایک ریستوران میں شام کو اصفہان کے مشہور سازندے سنتور بجاتے ہیں۔ پائیں باغ کے میکدے کے اندر قدیم پوشاک میں ملبوس افسانہ خوان شاہنامہ فردوسی پڑھتا ہے۔ قلیاں رکھے ہیں۔ دیواریں ڈھالوں اور

تلواروں سے آراستہ۔ مغربی سیاح قالینوں پر بیٹھے قلیان گڑگڑا رہے ہیں۔
ان کے تصورات کا روایتی افسانوی ایران ان کے سامنے موجود ہے۔

دوپہر کو ایک ایوانِ طعام میں بیگم آغا خان اور پرنس ایمن بیٹھے نظر آئے کہ جشنِ تاج گذاری کے لئے آئے ہیں۔

ہوٹل شاہ عباس سے ملحق ایک قدیم اور مشہور مذہبی مدرسہ واقع ہے میں نے کل شاہ عباس کے جنرل مینیجر سے کہا تھا کہ اس مدرسے کے رجسٹرڈ سے ملنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے ذرا تعجب سے مجھے دیکھا پھر معلوم کر کے بتایا کہ وہ طہران گئے ہوئے ہیں۔ مدرسے کا گنبد میرے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا ہے۔ رات کو ایک اور ایوانِ طعام میں مغربی آرکیسٹرا تازہ ترین مغربی دھن بجا رہا ہے۔ ایرانی لڑکے لڑکیاں مصروف رقص۔ ہم سارے بیرونی صحافیوں کا گروہ ایک طویل میز پر بیٹھا ہے۔ اس گروہ میں دو نوجوان ترک جرنلسٹ بھی شامل ہیں۔ احسان اور گلعذار خانم دونوں انقرہ سے آتے ہیں۔

میرے نزدیک بیٹھا لندن ٹائمز کا رسے شہزادی مارگریٹ اور لارڈ اسنوڈن کا ذکر کر رہا ہے۔ رسے لارڈ اسنوڈن کا پرانا دوست ہے۔

اداس صورت ترک لڑکی گلعذار خانم ایک ہنگرین جرنلسٹ کے مقابل بیٹھی ہے۔ ہنگرین اس لڑکی سے ذرا متاثر معلوم ہوتا ہے۔ گلعذار اداسی کے ساتھ رقصاں جوڑوں کو دیکھ رہی ہے۔ ہنگرین اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ گلعذار بہت حسین لڑکی ہے۔ اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ۔

ہنگرین اس سے بات شروع کرتا ہے۔ وہ جواب دے کر پھر دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ اے ترک شوخ ایں ہمہ ناز و عتاب چیست۔
رتے آہستہ سے مجھ سے کہتا ہے "یہ لڑکی اتنی غمزدہ کیوں رہتی ہے؟"
ہنگرین اس سے پوچھتا ہے۔ "تم کبھی ہنگری آئی ہو؟"
"نہیں۔" وہ آہستہ سے جواب دیتی ہے۔ "میرا منگیتر ۵۶ء میں ہنگری میں مارا گیا تھا۔"
"اوہ۔ مجھے افسوس ہے۔" ہنگری کھانے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔
مانچسٹر گارجین کے انگریزی نمائندہ نے جو میرے بائیں جانب بیٹھا ہے۔ بحیرۂ خزر کی کیسویار کھاتے کھاتے اچانک اس سے آہستہ سے کہا:
DAY AFTER TOMORROW I WILL 9.0 BACK TO THE WARS

دوسری صبح اصفہان کے ایک مشہور مصور آقائے علی سجادی مینا تورست کا نگار خانہ۔ آقائی سجادی روایتی مینا تور بناتے ہیں۔ فوراً ایک مختصر تصویر سیاہ قلم سے بنانی شروع کی اور کہا آپ میں سے جس کا جی چاہے اسے لے لیجیے۔
گروہ میں مغربی جرمنی کی ایک ذرا پختہ عمر خاتون صحافی بھی شامل تھیں۔ انہوں نے تصویر کو بہت للچائی نظروں سے دیکھا۔ میرے ہم وطن پتر کار فوراً بولے: "ہاں ہاں آپ سب سے زیادہ ضعیف اور سینئر لیڈی ہیں۔ یہ تصویر آپ ہی لے لیجیے۔"

میں نے آہستہ سے ان سے کہا: "عورت کتنی ہی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو کبھی

اس طرح نہیں کہتے، یہ خلاف تہذیب بات ہے۔"

"کیوں؟ ازنٹ شی این اولڈ لیڈی؟" باآواز بلند دریافت کیا گیا۔
سب بے حد خجل ہوئے۔ بے چاری جرمن خاتون کھسیانی ہنسی ہنسیں۔
آقائے علی سجادی نے انتہائی گیلنٹ انداز سے اٹھ کر تصویر ان کو پیش کی۔

اصفہان سے باہر ارمنی شہر جلفا میں دوسرے روز ہم لوگ کیتھڈرل کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ آپ نے فرمایا" یہ کیا بات ہے کہ یہ ہے تو چرچ مگر ایک دم مسجد کے موافق معلوم دیتا ہے۔"

"یہ چرچ۔" اب میں نے ان کو ایرانی فن تعمیر پر ایک مختصر لیکچر دینا مناسب جانا۔" شاہ عباس کبیر نے سترہویں صدی میں اپنی ارمنی رعایا کے لئے بنوایا تھا لہذا اسی دور کا طرز تعمیر۔"

"اچھا تو ایسا ہو۔"

اندر قربان گاہ پر اٹھارہویں کا ایک حسین پردہ ہوا تھا جس کے پھول کاڑھتے کاڑھتے ایک ارمنی دوشیزہ یسوع کو پیاری ہو گئی تھی۔" پادری نے بتایا۔

"ویری سیڈ۔ ویری سیڈ۔" پترکار نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلایا۔ میوزیم کے قدیم نسخوں میں اٹھارہویں صدی مدراس کے ارمنی چھاپہ خانوں کی شائع شدہ کتابیں رکھی تھیں۔ گرجا کی دیواروں پر حسین فریسکو۔
باہر خاموش سڑک پر زرد پتے اڑ رہے تھے۔ گلعذار خانم اور احسان

کوچ میں بیٹھے رہے۔ ایک ارمنی گرجا کے اندر جانا انہیں گوارا نہ تھا۔ "تم کو تو معلوم ہے ۱۹۱۴ء میں سلطنتِ عثمانیہ کس طرح تباہ ہوئی۔" گلعذار نے آہستہ سے کہا۔

قومی نفرتیں دیر پا ہوتی ہیں۔

رتے واپس آکر کوچ میں بیٹھا۔ اچانک اس نے سامنے نظر ڈالی۔ گرجا کے پھاٹک پر جو کلاک لگا تھا اس پر لکھا تھا۔ "میڈ ان ہانگ کانگ ۱۸۷۳ء" رتے ہنس پڑا۔ "ایران میں ارمنی چرچ اور اس پر ہانگ کانگ کا بنا برطانوی کلاک۔"

جلفا سے آگے کوئے حکیم نظامی ہے اور کوئے سنگ تراشہا زایندہ رود کے پل پر سے گزر کر خیابان خاقانی کو پیچھے چھوڑتے ہم لوگ شہر واپس آئے (ذرا اصفہان کی سڑکوں کے نام سنیئے۔ خیابان صائب۔ کوئے دالانِ بہشت۔ خیابان سروش۔ خیابانِ صور اسرافیل۔ خیابان ہاتف۔ کوئے عطارہا۔ خیابان ناصر خسرو۔ کوئے ابن سینا۔ اور محلے، جوبارہ۔ گل بہار — لون بان)۔

لیکن زایندہ رود یعنی زندہ رود نہایت انٹی کلائمیکس نکلی۔ ایک پتلی سی مٹیالی ندی اور اس پر شاہ عباس کبیر کا بنوایا ہوا حسین پل جس طرح لینن گراد پیٹر اعظم کا شہر ہے۔ اصفہان میں شاہ عباس کی شخصیت کی جھلک ہر طرف موجود۔

مسجد شیخ لطف اللہ کے پھاٹک کی محراب پر نادِ علیؑ لکھا تھا۔ پھاٹک

کے دونوں طرف جو گلدان تراشے گئے تھے ان میں سے ایک ذرا سا نامکمل تھا۔ آقائی منوچہر گائیڈ نے بتایا۔" صناعِ کامل صرف خدا ہے۔ اس وجہ سے ایرانی حسن کار اپنے فن پاروں میں ایک ذرا سی کسر چھوڑ دیا کرتے تھے۔

" یہ بھی اچھا پوائنٹ ہے۔ " پتر کار نے سنجیدگی سے کہا۔

مسجد کے صحن میں سکول کے بچوں کے ایک گروہ نے ہمیں گھیر لیا۔ یونیفارم میں ملبوس فرینچ اور فارسی بولتے بچے اپنی استانی کے ساتھ سیر کرتے آئے تھے۔

" بتاؤ ترکی کہاں ہے ؟ " احسان نے ان سے انگریزی میں پوچھا۔ استانی نے سوال کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ایک سرخ گالوں والے بچے نے ترکی یہ ترکی جواب دیا :

" وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیئے۔"

" یہ دنیا کی سب سے بڑی، سب سے شاندار مسجد ہے۔" ایک بچے نے مجھ سے کہا۔

قوم پرستی۔

" انہوں نے دلّی کی جامع مسجد نہیں دیکھی۔" پتر کار نے مجھ سے چپکے سے کہا۔

قوم پرستی۔

"اس مسجد کی ساری حسن کاری آذر بائیجان کے ترک صناعوں نے کی تھی"
احسان نے چپکے سے مجھ سے کہا۔
قوم پرستی۔
قصر چہل ستون میں اطالوی کاریگر قدیم فریسکو ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ ایک فریسکو میں شاہ طہماسپ صفوی کے دربار میں ہمارا ہمایوں بے چارہ سانولا اور چھوٹا سا ایرانی بادشاہ کے سامنے دوزانو بیٹھا ہے۔ اس کے مغل امراء بھی سانولے چھوٹے سے۔ سامنے رقاصہ ناچ رہی ہے ملٹری ایڈ لینے آیا تھا مل گئی۔
میں نے پتر کار کو بتایا۔ ان کا جذبۂ وطن پرستی پھر جاگ اٹھا۔ "دیدی ہمارے انڈین بادشاہ کو اتنا چھوٹا سا کیوں دکھایا ہے؟"
"ہمارے مغل مصوروں نے اپنی تصاویر میں صفوی بادشاہوں کو منحنی دکھایا ہوگا" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ دیکھئے اس محل میں ہیں صرف بیس ستون۔ کہلاتا ہے چہل ستون۔ وہ سامنے تالاب میں ان ستونوں کا عکس پڑتا ہے ان کو چالیس کر دیا۔
"یہ ایرانی بڑے طباع لوگ ہیں" پتر کار نے سر ہلا کر کہا۔

طہران میں شاہراہ پہلوی کے کنارے ایک سائیڈ واک کیفے میں دھاری دار چھتریوں کے نیچے بیٹھے لوگ قہوہ پی رہے ہیں۔ نزدیک ایک بے حد فربہ سرمئی بلی ایک چنار کے نیچے قنات سے آنکھیں موندے

دھوپ سینک رہی ہے۔

"وہ دیکھو ایرانی بلّی۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"ایران میں کیا جاپانی بلّی ہوگی؟" بریڈا نے جواب دیا۔ بات بھی معقول تھی۔

ایک سبزہ زار میں صنوبر کے نیچے غالیچہ بچھائے ایک غریب کنبہ تربوز کھا رہا تھا۔ سامنے نان رکھے تھے۔ ڈیوڈ نے فوراً کہا: "اے جگ آف وائن۔ اے لوف آف بریڈ اینڈ داؤ۔"

ہلٹن کے نزدیک صنعتی نمائش لگی ہے۔ شاہ و شاہبانو اسے ملاحظہ کرنے میں مصروف ہیں۔

ایک صنوبر کے نیچے ایک طویل القامت عباپوش عرب سب سے الگ تھلگ کھڑا سارا نظارہ دیکھ رہا تھا۔

تا ز صحرائے رسیدش محشرے
آنکہ داد اورا حیاتِ دیگرے

نمائش کی چہل پہل سے کچھ دور اقوام متحدہ کے خیمے نصب تھے۔ وہاں ایک خاموش روش پر ایک صاحب ٹہلتے نظر آئے۔ صورت کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ ایران میں اجنبی۔

THE CAT THAT WALKED ALONE

ن۔م راشد کہنے لگے۔ "میں پچھلی جنگ عظیم میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔ برسوں سے یہاں رہتا رہا ہوں۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایران کتنا

بدل گیا۔"

"اور ہمارے دیکھتے دیکھتے دنیا کے بہت سے ملک کیسے بنے کیسے بگڑے۔" میں نے جواب دیا۔

زمانہ جہاں زاد وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں کی مانند۔

حصّہ دوم

تعارف :- رمیش سنگھوی سابق فارن ایڈیٹر بلٹز نے جن کو میں لندن کے زمانے سے جانتی تھی جہاں وہ قانون کے طالب علم تھے۔ آج سے پندرہ سولہ سال قبل بطور صحافی شاہ ایران کو انٹرویو کیا۔ اس کے بعد کئی بار شاہ سے ملے۔ واپس بمبئی آکر بہت تعریف کی "بے حد ذہین پڑھا لکھا اور مدّبر آدمی ہے۔ سوشلسٹ ہو گیا ہے۔ جاگیرداروں اور ملاؤں کا زور اس نے ختم کیا۔ عورتوں کو مکمل آزادی اور حقوق دیئے۔ سپاہِ دانش گاؤں گاؤں تعلیم بالغاں میں مصروف ہے۔ دونوں میاں بیوی ملک و قوم کی خدمت میں جُٹے ہوئے ہیں۔"

رمیش خود نہایت ذہین اور پرانے پروگریسیو آدمی تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے شاہ کی ضخیم سوانحِ حیات لکھ کر لندن سے شائع کی۔ لندن میں ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا جس میں مختلف ملکوں کی حکومتوں کے پبلک ریلیشنز کی کتابیں چھاپنا شروع کیں۔ حکومت ایران، شاہ کے اور انقلابِ سپید

کے متعلق کتابوں کا پورا سیٹ لندن سے شائع کیا۔ اس سلسلے میں ان کی شاہ سے کافی گہری دوستی ہو گئی۔ ۶۹ء میں رمیش سنگھوی نے مجھ سے کہا "شہبانوے ایران ایک نہایت غیر معمولی قسم کی خاتون ہیں۔ مغرب میں ان کی سوانح حیات بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ فرح پہلوی ایک مڈل کلاس لڑکی ہے اور عوام دوست۔ اور اپنے ملک میں ملکہ ثریا کے برعکس نہایت ہر دلعزیز ہو چکی ہیں کیونکہ سماجی فلاح و بہبود کے لئے ذاتی طور پر خود ان تھک کام کر رہی ہیں۔ ملنسار اور نیک دل ہیں۔ میں نے شاہ سے کہا ہے کہ ہر میجسٹی سے متعلق انگریزی میں کتاب لکھوائیں۔ شہبانو ایران کی عورتوں اور بچوں اور فن کاروں کے لئے بہت کچھ کر رہی ہیں۔ میں نے شاہ سے تمہارا تذکرہ کیا ہے کہ اس قسم کی سوانح حیات تم بہت اچھی طرح لکھ سکو گی۔ تم ایران کی تاریخ و تمدن سے بخوبی واقف ہو اور "فرح اسٹوری" کے ہیومن اینگل کو بھی سمجھتی ہو۔ اس کتاب کو یورپ کی چھ زبانوں میں انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کیا جائے گا اور ۷۱ء میں ایرانی شہنشاہیت کے ڈھائی ہزار سالہ جشن کے موقع پر ریلیز کی جائے گی۔ میں نے رچرڈ فرائی سے طے کر لیا ہے۔ تاریخ ایران کے اس موقع کے لئے وہ کتاب لکھیں گے تمہاری اور رچرڈ فرائی کی کتابیں ایک ساتھ ریلیز ہوں گی۔"

(رچرڈ فرائی "ایران قدیم" کے مصنف ایک نامور مستشرق اور مورخ ہیں) چند ماہ بعد رمیش لندن سے آئے تو بتایا کہ اب یوروپ اور امریکہ کی چند مشہور جرنلسٹ خواتین اور حضرات شاہ بانو کے متعلق کتاب کا

اسائنمنٹ حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن شہبانو کا اصرار ہے کہ یہ کتاب مشرقی مصنفہ ہی لکھیں کیونکہ بحیثیت ایک جدید ایشیائی مسلم خاتون وہ اس موضوع کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گی۔

آخر ستمبر ۱۹۷۳ء میں رمیش نے طہران سے ٹرنک کال کیا کہ جلد از جلد طہران پہنچو۔ فرح پہلوی چاہتی ہیں کہ اکتوبر کے مہینے میں تم زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزار سکو۔

دو روز بعد ویو سنگھوی نے مجھ سے کہا۔ رمیش نے پھر طہران سے فون کیا تھا وہ لندن چلے گئے تم فوراً ایران روانہ ہو جاؤ۔ منسٹری آف کورٹ تمہاری میزبان ہوگی اور وہ تمہارا سارا پروگرام مرتب کر چکی ہے۔

۱۔ "سنڈریلا اسٹوری"

اکتوبر ۱۹۷۳ء اتوار کا دن۔ فرودگاہ مہرآباد کے باہر ایک کوائسک میں ایک اہل کار ایرانی کیتھولک لڑکی سیاہ جالی کا رومال اوڑھے ہاتھ میں تسبیح لئے اپنی ڈیوٹی پر مستعد بیٹھی تھی۔ چہرے مہرے سے یہ لڑکی ارمنی معلوم نہیں ہوتی بلکہ خالص ایرانی۔ پچھلی صدیوں میں یوروپین مشنری یہاں لوگوں کو بپتسمہ دیتے گئے گو ایران سمیت خاور میانہ میں عموماً ہر جگہ ناکام رہے تھے۔

دربارہ۔ رویال ہلٹن ہٹل۔ کافی شاپ میں بیرونی سیاحوں کا مجمع۔ اس کافی شاپ میں اکثر مشاہیر عالم بیٹھے نظر آتے ہیں۔

رات کو اپنے کمرے سے رمیش کو لندن ٹرنک کال کی۔ رمیش نے کہا؛

"پہلا کام تم یہ کرو فویرٹ میں کتابوں کے شال سے شاہ کی کتاب MISSION FOR MY COUNTRY خرید کر اسے پڑھ لو۔ اگلے ہفتے میں ایک مشہور فوٹوگرافر اور فلم ڈائریکٹر طہران بھیج رہا ہوں۔ اپنی کتاب کے لئے اس سے شاہی خاندان کی تصویریں کھنچوانا۔"

"میں اس کہانی میں بالکل ہیومن اینگل چاہتی ہوں NO POLITICS" میں نے کہا۔ "اور قصیدہ خوانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"بالکل ہیومن اینگل۔" رمیش کی آواز آئی۔ "یہ ویسٹرن ریڈرشپ کے لئے ایک سنڈریلا اسٹوری ہے۔ کیسی قصیدہ خوانی۔"

"لیکن میں محض FARY TALES نہیں لکھتی۔ اس کے پیچھے پوری تاریخ ایران ہے۔"

"ہاں۔ لیکن ہسٹری سے کتاب کو HEAVY مت کر دینا" رمیش بیچارے نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔

"اس کی تم فکر مت کرو COLLIERS میگزین پڑھنے والوں کو یہی تاریخ ایک دلچسپ انداز سے سمجھائی جا سکتی ہے۔ سارا WEST اسلام اور ایشیا کے متعلق بالکل جاہل ہے حالانکہ اسلام یہاں ایران میں میں نے دیکھا ہے کہ بالکل PLAY DOWN کیا جا رہا ہے لیکن بہرحال فریم ورک تو وہی ہے۔"

"اس میں پھر سیاست آ جائے گی۔"

"وہ سب میں دیکھوں گی کس طرح لکھوں۔" میں نے جواب دیا۔

"گڈ نائٹ۔"

اسلام، ملائیت، تودہ پارٹی۔ ڈاکٹر مصدق، ڈاکٹر حسین فاطمی۔ انقلابِ سُرخ انقلابِ سپید۔ یہ سنڈریلا اسٹوری نہیں تھی۔

سارا طہران بے حد پر امن ہے اور انتہائی منظم۔ جلسے جلوس، سیاسی ہنگامے جھگڑے فساد ناپید۔ ہر طرف دولت کی ریل پیل۔ بڑھیا ڈیپارٹمنٹ سٹور اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ۔ اونچے اونچے بنک۔ موٹر سائیکل سوار زنانہ پولیس کے دستے۔ چپے چپے پر شاہ اور شاہ بانو اور ولی عہد کے عظیم الجثہ پورٹریٹ۔ "ALL THIS IS TOO GOOD TO BE TRUE" کل ایک مغربی سیاح مجھ سے کافی شاپ میں کہہ رہا تھا۔

منسٹری آف کورٹ کے وسیع باغ میں چیڑھ کے اونچے درخت موسم خزاں کی ہوا میں سرسرا رہے ہیں۔ اندر جگمگاتی خاموش راہداریوں میں ٹیل کوٹ اور دھاری دار پتلونوں میں ملبوس درباری افسر بتوں کی طرح ساکت و جامد کھڑے ہیں۔ یوروپ کے شاہی خاندان ذرا بے تکلف ہو گئے ہیں مگر برطانیہ اور ایران کی شاہی روایات قواعد و ضوابط میں مجال ہے جو سرِ مو فرق پڑا ہو۔ دربارِ ایران یوروپ کے کسی ملک کا رائل کورٹ معلوم ہوتا ہے۔ یوروپ میں محض البانیہ ایک مسلمان بادشاہ کا ملک رہ گیا تھا جس کے آخری فرمانروا شاہ احمد زوغو ۱۹۳۹ء تک تو تھے اب جانے کہاں ہیں۔ البانوی نژاد شاہ فاروق بے چارے، جو تاش کے چار بادشاہوں اور پانچویں برطانوی بادشاہ کے متعلق لطیفہ سنا گئے۔ عالمِ جلاوطنی میں انہوں نے بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ وہ شہنشاہ آریہ مہر کے سابق برادرِ نسبتی تھے۔

منسٹری آف کورٹ کے اندر آغا ئے موتمنی کا وسیع دفتر (یعنی آغائے متقی۔ اہل ایران ق کو غ ادا کرتے ہیں) موصوف جنوبی ہند کے باشندے ہیں اس وجہ سے ذرا گندمی رنگت والے نوجوان ہیں۔ وسیع دریچوں میں سے درختوں کی دھوپ چھاؤں اندر آرہی ہے۔ علیا حضرت کے ساتھ ملاقاتوں کا سارا پروگرام ان کی میز پر موجود ہے۔ باہر شمران کے پر فضا علاقے میں سردی کی لہر بڑھتی جارہی ہے۔ یہ ماہ آبان ہے۔ فصل پرپز۔ بہت جلد درختوں کے پتے ارغوانی ہوجائیں گے۔

ماہ آبان انتہائی چہل پہل کا زمانہ ہے کہ اس مہینے میں سارے ملک میں بے حد دھوم دھام سے شاہ، ان کی توام بہن شہزادی اشرف، شہبانو اور ولیعہد کی سالگرہیں منائی جاتی ہیں جو سب اتفاق سے اسی مہینے میں پیدا ہوئے تھے۔

شمران میں ڈپلومیٹک کور والوں کی کوٹھیاں، سارے شہر میں عالیشان مکانات اور جدید اپارٹمنٹ بلاک۔ محلے کی صاف شفاف گلیوں میں پرانے مکانات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اونچی چہار دیواری۔ ڈیوڑھی کے اندر سیب کے درخت۔ افسانوی ماحول۔ سارا دارالسلطنت صاف ستھرا اور منظم۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایشیائی شہر ہے۔

اختر حسین رائے پوری ایک وضع جدید کے دو منزلہ مکان کی دوسری منزل پر مقیم ہیں۔ پھاٹک پر انٹرکوم کا مائک نصب ہے۔ اندر سے اختر حسین صاحب کی آواز آئی۔ اور پر حمیدہ باجی (علیگڈھ والے چچا ظفر عمر کی سب سے بڑی بیٹی) حسبِ عادت پاندان سامنے رکھے تخت پر بیٹھی ہے۔ راشد صاحب کی طرح ڈاکٹر اختر حسین بھی یہاں یونیسکو میں تعینات ہیں۔ عنقریب پیرس

جانے والے ہیں۔

راشد صاحب ایک اور رہائشی علاقے کی دو منزلہ کوٹھی میں رہتے ہیں۔ سامنے بڑا باغ۔ طرز معاشرت مغربی..... انگریزی بیوی۔ نصف اطالوی۔ پہلی بیگم راشد کے انتقال کے بعد جب راشد صاحب نیویارک واپس گئے یہ خاتون ان کے بچوں کی گورنس تھیں۔ نہایت معقول اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ راشد صاحب سے پچھلی بار میری ملاقات طہران میں ہوئی تھی۔ اس سے قبل کراچی میں۔ موصوف کے خیالات میں زیادہ پختگی اور توازن آچکا ہے۔ بلحاظ سیاسی نظریات اب اتنے اینٹی انڈیا بھی نہیں رہے۔ طہران پہنچنے کے تیسرے روز جب میں نے موصوف کو ان کے دفتر فون کیا کہنے لگے اخاہ آپ اس مرتبہ کس سلسلے میں تشریف لائیں؟

عرض کیا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

بہت خوش ہوئے۔ فوراً اپنی کسی تازہ نظم کا ایک باموقع مصرع سنایا۔ شام کو اپنی نئی کتاب "لا۔ انسان" کی ایک جلد لے کر ہوٹل تشریف لائے۔ کہنے لگے "اس مرتبہ آپ طہران کے جدید شاعروں اور ادیبوں سے ضرور ملئے گا۔ ملنے اور بات کرنے کے قابل لوگ ہیں۔ ایک نئی ذہنی دنیا انہوں نے آباد کی ہے۔" میں نے جواب دیا "چند ہفتے شہبانو کے ساتھ گذارنے کے بعد اس طرف توجہ مبذول کروں گی۔" فرمایا اس کے بعد کہاں آپ کہاں وہ لوگ۔ میں نے کہا آپ کو حافظ اور ابواسحٰق اینجو کا قصہ یاد ہے کہ وہ اس بادشاہ کو خسرو نے

روئے زمین کے ساتھ ساتھ غوثِ زماں بھی کہتا تھا۔ امیر مبارز الدین کے دوسرے بیٹے جلال الدین شاہ شجاع کے لئے کہ علم دوست تھا کہا تھا۔

"وہی ۔۔ جس نے کہا کہ نگارِ من کہ بمکتب نرفت وخط ننوشت وغیرہ لیکن شہبانوے ایران تو خود آرٹسٹ اور علم دوست خاتون ہے اور میں تو جاروب کشِ مزارِ حافظ ہوں۔ خاکپائے حافظ وغیرہ۔"

"شہبانو سنا ہے بہت نیک دل اور بھلی بی بی ہے۔" راشد صاحب نے جواب دیا۔ "لوگ شاہ سے ڈرتے ہیں اور شہبانو سے محبت کرتے ہیں۔ ان کا وہ قصہ تو آپ نے سنا ہوگا؟ ایک مرتبہ یہ گرمیاں گزارنے کیسپئن کے کنارے گئی ہوئی تھیں۔ ایک روز جیپ خود چلاتی کسی پہاڑی راستے سے گذر رہی تھیں۔ ایک دیہاتی بڑھیا نے کوئی یوروپین لڑکی سمجھ کر ہاتھ اٹھایا اور لفٹ مانگی۔ شہبانو نے جیپ روک کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ بڑھیا اپنے گاؤں جا رہی تھی۔ راستے بھر ادھر ادھر کی باتیں کیا کی۔ آخر میں پوچھا بی بی تم کون ہو اور ادھر کیسے آئیں۔ انکسار سے جواب دیا "زنِ شاہ ہستم۔""

۲۔ کاخ سعد آباد

کاخ سعد آباد شمران میں رضا شاہ کبیر نے بنوایا تھا یوروپین وضع کا عظیم الشان محل۔ کئی ایکڑ پر پھیلے اس کے پارک لینڈ میں بلند و بالا درختوں پر صبح کی دھوپ، بارش کی لطیف پھواروں کی طرح برس رہی تھی۔ سارے میں بڑی مؤدب خاموشی طاری تھی۔ برآمدے میں چند السیشن کتے محوِ خواب۔

اندر وسیع مرمریں ہال میں چند درباری افسر اس طرح ٹیل کوٹ پہنے مجسموں کی طرح استادہ۔ فرانسیسی وضع سے آراستہ کمرۂ انتظار میں ایک ٹیل کوٹ والا افسر بغیر دودھ کی چائے پیش کر کے خاموشی سے واپس چلا گیا۔ میں اٹھ کر ہال میں گھومنے لگی۔ کاسنی رنگ کا فراق پہنے شہبانو دوسری طرف سے کسی سے کچھ کہتی ہوئی گذر گئیں۔ چند منٹ بعد ایک اے ڈی سی مجھے اوپر شہبانو کے دارالمطالعہ میں لے گیا۔ الماری میں فن تعمیر اور موڈرن آرٹ پر فرانسیسی کتابیں رکھی تھیں۔ کچھ دیر بعد علیا حضرت اندر آئیں۔ دوبارہ چائے پیش کی گئی۔ ہر امپیریل میجسٹی نے سگریٹ سلگایا۔ ایک نارمل ملنسار قسم کی لڑکی۔ ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو کے بعد کہا، "شام کو بھی آجانا۔ میں ٹیلی ویژن پر یہیں سے یوم اطفال کے لئے ایک پروگرام ٹیلی کاسٹ کروں گی۔ پرسوں ہم لوگ خراسان چلیں گے۔

گھنٹی بجائی۔ سکرٹری آقائے مسعود بازرین حاضر ہوئے۔ "خانم کو خراسان لے جانے کیلئے کمانڈر پلین تیار رہے۔"

مسعود بازرین نے سر تسلیم خم کیا۔

شاہانِ مغلیہ کے محلات میں بھی اس طرح احکام صادر ہوتے ہوں گے اور ان سب شاہانِ عالمِ اسلام نے اوّل اوّل اسی ایران کے شاہانِ ساسانیہ کے آداب اختیار کئے تھے اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے اس کاخ سعد آباد نے پرسی پولس اور پسارگاد اور سعد حقہ اور صفویہ اور قاچاریہ کے آداب و رسوم کو شہنشاہیٔ یوروپ کے رائل ایٹی کیٹ سے منسلک کر رکھا تھا۔ خود ہمارے نظام حیدر آباد کے ہاں چھوٹے پیمانے پر یہی سب کچھ ہوتا ہوگا۔

اپنے ۱۹۱۹ء تک بابِ عالی قسطنطنیہ میں اور ۱۹۵۲ء تک قصرِ شاہِ فاروق قاہرہ میں۔ لیکن ایرانی تکلفات اور شائستگی کی کوئی حد و انتہا نہیں اور اب یہ بے اندازہ دولت و ثروت۔ پیٹرو ڈالرز کا شاہی خاندان۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اگر کہیں ایران نہ فتح کیا ہوتا تو اسلامی تہذیب کا رنگ ہی بالکل مختلف ہوتا۔ شروع میں کیا سادگی تھی۔ اونٹ سے اترے۔ خلیفہ وقت کو السلام علیکم یا امیر المومنین کہا اور پھسکڑا مار کر سامنے بچھے ہوئے بوریئے پر بیٹھ گئے۔

شام۔ کاخ سعد آباد کے پہلو میں ایک وسیع تالاب کے سرسبز کنارے پر سرو کے درختوں کے نیچے چند کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ درختوں کے پیچھے آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ٹیلی ویژن والے اپنا ساز و سامان درست کرنے میں مشغول تھے۔ ایک ایرانی لڑکی کرسچین دالیور کی ماڈل کی طرح مکمل جو شہبانو کا انٹرویو لینے والی تھی، کرسی کے پاس منتظر کھڑی تھی۔

اچانک دور درختوں میں سے بلبل کی آواز سنائی دی۔ میں نے آقا سے مسعود بارزین سے پوچھا: "ایران میں بلبل کہاں کہاں پائی جاتی ہے؟" انہوں نے فوراً میرے سوال کو نوٹ کیا۔

"کل آپ کو مطلع کر دوں گا۔"

کچھ دیر بعد علیا حضرت کاخ کی اونچی مرمریں سیڑھیاں اترتی نظر آئیں۔ پیچھے پیچھے ایک اے ڈی سی ان کا منک کوٹ بازو پر ڈالے آ رہا تھا۔ علیا حضرت آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں اور یومِ اطفال کے لئے اپنی فی البدیہہ تقریر

نرمی اور روانی کے ساتھ شروع کی۔

پروگرام ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ اے ڈی سی منک کوٹ لئے سرد کے نیچے استادہ تھے۔ تالاب میں فوارے چل رہے تھے۔ ٹی وی والے لڑکے لڑکیاں اے ڈی سی سیکرٹری، سنہرے بالوں والی ملکہ، یہ سارا سنہرا افسانوی منظر یورپین تھا۔ محض ان کی فارسی زبان اور دور سے آتی بلبل کی آواز یاد دلاتی تھی کہ یہ یورپ نہیں، ایران ہے۔

ایران مشرق و مغرب میں واقع ہے۔ ہمیشہ سے جب وہ یونان سے لڑا اور روم سے لڑا اور پچھلی چند صدیوں میں روس سے لڑا۔ جغرافیائی اور نسلی اعتبار سے وہ مغرب کے قریب تو ہو رہا ہے۔ دریائے مازندران یعنی بحیرہ کیسپئن اور کوہستان قفقاز کے جنوب میں پھیلے کشور ایران اور اس کے پایہ تخت طہران کا رخ اب مغرب کی جانب بہت زیادہ ہے۔

طہران کا شاہی ایرپورٹ، جو صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص ہے مرمریں ایوان، مخملیں پردے، بڑھیا صوفے، ٹیل کوٹ والے افسر ریپ ریپ پھر رہے ہیں۔ میں نے سعود بارزین سے پوچھا کیا رضا شاہ کبیر کے زمانے میں بھی یہ شاہی شان و شوکت اتنی ہی تھی یا اس سے کم۔

"بالکل اسی طرح تھی۔" انہوں نے جواب دیا۔

شاہی خاندان صبح سویرے خراسان کے شہر بر جند جا چکا تھا۔ ایک افسر نے آکر کہا "خانم حیدری کے لئے کمانڈر تیار ہے۔"

۳۔ نوشتہ من ایں نامہ پہلوی

اس چھوٹے سے چار سیٹ کے طیارے کو جو شہبانو کی ذاتی فضائی FLEET سے تعلق رکھتا تھا، ایک نوعمر ایرانی ہواباز اڑا رہا تھا۔

کمانڈر طہران سے اٹھ کر طلوعِ خورشید کی سرزمین کی طرف مڑا۔ گو اس وقت خورشید غروب ہونے والا تھا۔ نیچے خشک چٹیل میدان۔ جگہ جگہ گول غار سے، جیسے چاند کی سطح۔ خورشید دیکھتے دیکھتے خراسان کی عمیق گھاٹیوں میں اتر گیا۔ اندھیرا پڑے ہم شہر بیرجند میں اترے۔ تاریک رات میں ہوائی اڈے سے کار میں بیٹھ کر بہت دور ایک صحرائی امیر کے الف لیلوی مکان میں پہنچے۔ یہ فضائیں تہران کی فضاؤں سے مختلف تھیں۔ یہ بالآخر مشرق تھا۔ لیکن وہ خراسانی امیر اور اس کے گھر کی خانمیں سب فرانسیسی نما۔ کھانے کی طویل میز پر دریائے مازندران کے کیویار کے انبار۔ اعلیٰ درجے کی شراب۔ خانم حیدری شراب نہیں پیتیں؟ مے نوش میزبان خانموں کا اظہار استعجاب۔ ذرا سی بھی نہیں؟ شیری بھی نہیں؟ وائن بھی نہیں۔ حیرت۔

خراسانی امیر کے مکان سے بہت فاصلے پر ایک نیا اعلیٰ درجے کا ہوٹل۔ چہار سو دور دور تک صحرا۔ گھپ اندھیرا وسیع رات۔ میں اپنے کمرے میں جانے کے بعد پھر باہر نکل آئی۔ چاروں طرف سناٹا اور انتھاہ تاریکی۔ پھاٹک پر جاکر دیکھا باہر کیا ہو رہا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہو رہا

تھا۔ سکوتِ کامل۔ ایک دیہاتی خاتم بند کی دار عنابی چادر۔ میں منہ لپیٹے سامنے سے گذر گئی۔

شاہی خیمہ گاہ۔ ریت پر بلوچی رقاص اور رقاصائیں ناچ میں مصروف۔ منڈیروں پر ٹکے شاہی مہمان رقص سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

دفعتہً شہبانو خود آکر رقص میں شامل ہو جاتی ہیں۔ شہزادگان اور شہزادہ خاتم فرح نازنے امریکن کاؤبوائے اور کاؤگرل لباس پہن رکھے ہیں۔ شہبانو سیلکس میں ملبوس ہر امپیریل میجسٹی کی والدہ مادام فریدہ دیبا بھی رقص میں حصہ لے رہی ہیں۔ شہنشاہ آریہ مہر ایک منڈیر پہ بیٹھے ہیں۔ میں سرحد کے کچھ فاصلے پر دوسری طرف کوئٹہ میں پاکستانی بلوچیوں کا بالکل اسی قسم کا ناچ دیکھ چکی ہوں۔ عجیب۔

رقص کے خاتمے کے بعد بلوچیوں پر انعام و اکرام کی بارش۔ اشرفیاں ریال۔ جدید الف لیلےٰ کی ایک رات۔ بادشاہ اور ملکہ اور امرائے دربار کا رقاصاؤں کو انعام دینے کا منظر پرانی داستانوں میں پڑھا تھا۔ یہ درباری امراء ایران کے متمول ترین طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ طرزِ زندگی بالکل مغربی۔ آدھا وقت یورپ اور امریکہ میں گذارتے ہیں۔ ان کی اولاد بچپن سے مغربی ممالک کے مہنگے اسکولوں میں بھیج دی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی ثانوی زبان فرانسیسی ہے۔ ان کی خانمیں اپنے بال BLEACH کروا کر یورپین نظر آنے کی پوری کوشش کرتی ہیں۔ (شہبانو اور انکی والدہ مادام فریدہ دیبا کے بال بھی مصنوعی طور پر سنہری ہیں)۔

صبح کی تیز دھوپ میں برجند کا شہر، صاف ستھری گلیاں، صاف ستھرے مکانات۔ ایک دومنزلہ مکان پر مقامی ڈاکٹر کے نام کا بورڈ، سفید دیواروں سے لگے، سفید شلواریں پہنے پٹھان نما مرد اور چادریں اوڑھے چہرے چھپائے عورتیں۔ شاہ و شہبانو کی سواری دیکھنے کے منتظر۔ ان کی اور امرائے دربار کی زندگیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

شام۔ ایک گھنا سرسبز باغ۔ وضع قدیم کی دومنزلہ عمارتیں، باغ میں نہریں۔ ایرانی مصوروں نے سولہویں صدی میں جو منظرکشی کی تھی وہ قطعی خیالی نہیں تھی۔

برجند میں دوسری رات آقائے اسداللہ عالَم منسٹر آف کورٹ کا کنٹری ہاؤس۔ خراسان کے دہقان یعنی جاگیردار عہد قدیم سے بہت دولتمند اور طاقتور چلے آئے ہیں۔ شاہ کی زرعی اصلاحات کے بعد ان کی زمینیں چھن گئیں لیکن پرانی سطوت و دولت ابھی موجود ہے۔ شاہ پرست طبقہ امرا۔ شہنشاہ آریہ مہر کا دست راست ہے۔

کنٹری ہاؤس کے چاروں طرف پائن کے اونچے درخت، چبوترے پر قالین۔ اندر کمروں میں ضیافت کے لئے میزیں چنی جارہی ہیں۔ ایک کمرہ حوض خانہ ہے۔ حوض میں فوارے۔ باہر باغ میں شاہی مہمانوں کا ہجوم کثیر جو سب طہران سے اڑکر آئے ہیں۔ ایوننگ گاؤنز اور ڈنر جیکٹ، ہیروں کی جگمگاہٹ، فرانسیسی میں گفتگو۔ باغ میں نصب چھوٹے چھوٹے خیموں میں امرائے دربار فروکش ہیں۔

IN XANADU DID KUBLA KHAN

صبح باغ کے سبزے میں مستعد ہیلی کوپٹر ہز اکسیلینسی ڈاکٹر کمال پاشا بہادری اب آپ کو الکورٹ کریں گے، سعود بارزین نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر طہران واپس جانے کے لئے کمانڈر پلین پر سوار ہو گئے۔ ڈاکٹر بہادری امریکہ کے تعلیم یافتہ نوجوان، خوش شکل سیاست دان جو ڈپٹی پرائم منسٹر رہ چکے ہیں۔ آج کل شہبانو کی کابینہ کے صدر ہیں۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آذر بائیجانی ہیں۔ ان کے بزرگ بھی شاہان قاچار کے امرا تھے۔ اگلے ہیلی کاپٹر پر شاہ و شہبانو بیٹھے ہیں۔ ہیلی کاپٹر شہنشاہ خود اڑا رہے ہیں۔ ہمارا ہیلی کاپٹر شاہ کے پیچھے پیچھے اڑ رہا ہے۔

ایک گاؤں جو پچھلے سال کے خوفناک زلزلے میں تباہ ہو گیا تھا سال بھر کے اندر اسے دوبارہ تعمیر کر لیا گیا ہے۔ گاؤں والے قرآن شریف اور حضرت علیؓ کی بڑی سی تصویر سنبھالے استقبال کے لئے موجود۔ شاہ و شاہبانو مع پارٹی گاؤں کی جدید زلزلہ پروف عمارتوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ کیونٹی سنٹر کے ہال میں بانات کی طویل میز۔ ایک چھوٹی میز پر گراموفون رکھا ہے۔ ایک فولڈنگ میز کی مضبوطی ٹیسٹ کرنے کے لئے شاہ اس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کا تختہ ذرا ٹیڑھا ہو گیا فوراً اٹھے۔

دوسرے گاؤں میں قالین بافی کا کارخانہ۔ سرخ گالوں والی خراسانی لڑکیاں، سر پہ پھول دار رومال باندھے کرگھوں کے سامنے بیٹھی ہیں۔
بستی کے سرے پر پائن کے جھرمٹ۔ ایک درخت کے نیچے فولادی

ہیلمٹ اوڑھے ایک فوجی بت کی طرح کھڑا ہے۔

گاؤں کی عورتیں دوڑتی ہوئی آئیں۔ شہبانو کو گھیر لیا اور اپنے اپنے دکھ درد سنانے لگیں۔ ایک افسر ایک ٹوکری لئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گاؤں والوں کی درخواستیں اور خطوط جو انہوں نے شاہبانو کے نام لکھے ہیں وہ اس ٹوکری میں ڈالتا جا رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ آشوب چشم میں مبتلا ہے۔ اسے بذریعہ طیارہ اسی وقت برائے علاج مشہد روانہ کیا جاتا ہے۔

اچانک ایک خفقانی عورت مجمع سے نکلی اور چیختی چلاتی فرح پہلوی کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ "یہ عورت دیوانی ہوگئی ہے اس کے شوہر نے اس پر بے انتہا مظالم کئے ہیں۔" کسی نے مجھ سے کہا۔

وہ اسی طرح چیختی ہوئی شہبانو کا تعاقب کرتی رہی۔ پاگلوں کو بادشاہوں کا خوف نہیں ہوتا۔ اسے بھی برائے علاج مشہد روانہ کیا گیا۔

تیسرا گاؤں۔ چوتھا۔ پانچواں۔ ہیلی کاپٹر زلزلے سے تباہ شدہ علاقے کے اوپر اڑتے پھرے۔ ہر گاؤں میں ایک سی رسومِ استقبال۔ وہ قان سامنے آکر بادشاہ کو مخاطب کرتا "شہنشاہا!" اور رپورٹ پیش کرتا۔ زلزلے کے بعد ان گاؤوں میں نئے شفا خانے، حمام، اسکول اور کتب خانے و مساجد تعمیر کی گئی ہیں اور ہر مسجد کے سامنے منبر پر رسولؐ اللہ، حضرت علیؓ کی تصاویر جو پرانی ایرانی روایت ہے (عثمانی ترکوں نے سولہویں صدی میں حیاتِ نبوی کا پورا البم مصور کیا تھا۔ یہ البم استنبول کے توپ کاپو میوزیم میں موجود ہے۔ ایرانی تصاویر اور ان ترکی تصاویر میں صرف یہ فرق ہے کہ

ہر موخر الذکر میں رسول اللہ کی شبیہہ مبارک کے بجائے چہرہ مبارک پر نقاب دکھائی گئی ہے۔)

بہر حال یہ تو دیہی ایران کی ان مساجد کے باہر منبر پر رسولؐ و علیؑ کی کی تصاویر کے نیچے شاہ و شہبانو کے فوٹوگراف موجود ہیں۔ یہ بہت معنی خیز بات ہے۔

وہ بڑے سائز کا قرآن شریف ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ میں اور ڈاکٹر کمال پاشا بہادری اسے باری باری ہاتھ میں لیتے۔ دیہات کے ان سارے مجمعوں میں عبا پوش ملا البتہ کہیں نظر نہ آئے۔

شہر گناباد۔ ہیلی کاپٹر سے شہر کے نیلے گنبد دکھائی دیتے۔ مکانوں کی سپاٹ چھتیں۔ اونچی محرابوں والے دالان۔ ہر صحن میں حوض۔

گناباد ہوٹل میں ضیافت کی میز پر مشہد کے شیریں تربوز اور خربوزے ایک درباری امیر نے مجھ سے کہا "یہ نوش کیجئے۔ یہ پھل آپ نے پہلے کبھی نہ کھائے ہوں گے۔"

اہل ایران کی حب الوطنی قابل تعریف ہے۔ باہر کچھ فاصلے پر وہ مہیب فوج بردار طیارہ کھڑا تھا جس پر ہم سب تہران واپس جانے والے تھے۔ شہنشاہ آریہ مہر پائلٹ کی سیٹ پر جا بیٹھے۔ ان کے ساتھ معاون ہوا باز نہیں تھا۔ اتنا بھاری طیارہ خود اکیلے اڑائیں گے۔ شہبانو ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ اندر فوجیوں کے دو رویہ BUNKS مادام فریدہ دیبا سردے کی قاشیں تراش تراش کر سب کو دیتی رہیں۔

۴۔ اصفہان نصف جہان

طہران واپس آنے کے چند روز بعد اصفہان شہنشاہ مع عملے کے ایک دن قبل جا چکے تھے۔ فرح پہلوی بعد میں مجھے اپنے ہمراہ لے کر جا رہی تھیں۔ میں اور ڈاکٹر بہادری شاہی ایرپورٹ پر شہبانو کے ہیلی کاپٹر کے منتظر تھے جس کے لئے وہ کاخ سعد آباد سے آنے والی تھیں۔ کچھ دیر میں ہیلی کاپٹر آن کر اترا۔ اس کے پنکھوں کی ہوا سے باغ کے سرو و شمشاد لرز اٹھے۔

فرح پہلوی اتر کر اپنے ذاتی چھوٹے پلین میں سوار ہوئیں جس میں کمانڈر سے زیادہ جگہ تھی۔ دس بارہ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک طرف ہر میجسٹی کو لیڈیز ان وٹینگ دمکل میک اپ، بہترین ہیئر اسٹائل، خاموش مودب بیٹھی تھیں۔ میں نے اندر جا کر شہبانو کے مقابل کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا: "یور میجسٹی میں دراصل رائلٹی سے ملتے رہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔"

"کیوں؟"

"ذرا میرے بال ملاحظہ کیجیے۔"

انہوں نے میرے بے ترتیب جھوا بالوں کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ دراصل وہ مسلسل اور مستقل انتہائی مودب، مکمل فیشن ایبل خواتین سے ملتے ملتے اس قدر اکتا چکی ہوں گی کہ میری نسبتاً بے تکلفی اور نیچرل پن ان کو مختلف اور اچھا لگتا ہوگا۔ اور میں کتابت کے لئے ان سے مستقل سر

طرح کے ذاتی سوال کرتی رہتی تھی۔ وہ ایک موضوع اور میں ایک مصنف اور جرنلسٹ تھی اور وہ ایک ذہین اور سمجھ دار خاتون کی حیثیت سے مکمل تعاون کرتی تھیں۔

فارس جاتے ہوئے طیارہ پھر چٹیل میدانوں پر سے گزر رہا تھا۔ وہی غار نما گول گڈھے۔ فرح پہلوی نہایت اشتیاق سے اس منظر کو دیکھتی رہیں۔ گو اسے انگنت بار دیکھا ہوگا۔

"تم کو یہ کیسا لگتا ہے؟"

"مون اسکیپ۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں واقعی مون اسکیپ۔ اور وہ دیکھو کریز۔ یہاں پانی جمع کیا جاتا ہے۔ اور وہ دیکھو کبوتروں کے مینار۔"

اصفہان ایرپورٹ پر شہنشاہ آریہ مہر مع اپنے جرنیلوں کے شہبانو کے استقبال کے لئے منتظر کھڑے تھے۔ شہبانو آگے آگے گئیں۔ میں اپنا سفید اوور کوٹ اور کارڈیگن اٹھا کر پلین سے اتری۔ ایک جنرل صاحب مجھے ایسکورٹ کر رہے تھے۔ ایرپورٹ کے اندر پہنچ کر مجھے بہت ہلکا ہلکا سا لگا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک اور جنرل صاحب میرا کوٹ اور کارڈیگن اٹھائے بسرعت چلے آرہے تھے۔

"یہ آپ نے پلین سے اترنے میں نیچے گرا دیا تھا۔"

ایک بار پھر ہوٹل شاہ عباس جہاں گلاب کے پھولوں کے انبار لگے ہیں۔ گاوؤں میں بھی جن قالین پوش طویل راستوں سے شاہی پارٹی گذرتی

تھی ان پر قدم قدم پر گل و لالہ بکھیرے گئے تھے ۔ ایسے خشک ملک میں
گلاب کی یہ کثرت تعجب خیز ہے ۔ بارش بہت کم ہوتی ہے ۔ دریا بھی ناپید
ہیں اور پھولوں اور سبزے کی یہ فراوانی ۔ ضرور یہ زمین دوز کریز اور چشموں
کی کارستانی ہے ۔

شاہ و شہبانو مع وزراء و امراء ہوٹل شاہ عباس کے فوئیر میں کھڑے
تھے ۔ میرا سوٹ کیس صبح سویرے تہران سے شاہ و شہبانو کے اسباب کے
ساتھ شاہ کے بڑے طیارے پر بھیج دیا تھا ۔ وہ سامان اب اتار کر فوئیر میں
لایا جا رہا تھا ۔ میں سنہرے منقش کاونٹر کے پاس اپنے سوٹ کیس کی منتظر
کھڑی تھی جس میں حسبِ عادت مجھے تالا لگانا یاد نہ رہا تھا ۔ سارا سامان آ گیا
مجھے اپنا سوٹ کیس نظر نہ آیا ۔ ہال میں شہنشاہ اور شہبانو کی موجودگی کی وجہ
سے نہایت مؤدب خاموشی طاری تھی ۔ میں نے اطمینان سے باآواز بلند
دریافت کیا ۔

" یہ کیا گڑبڑ ہے ؟ میرا سوٹ کیس کہاں ہے ؟ "

میں کہ ایک جمہوری خاتون ہوں اور مراسم دربار داری کی عادی نہیں ۔
لہٰذا میں نے دوبارہ باآواز بلند دریافت کیا ۔ ایک افسر نے گھبرا کر جلدی سے
کہا : " خانوم آپ کا سوٹ کیس یہ رہا ۔ "

ایک الف لیلوی پوشاک والے BELL HOP نے میرا سامان بذریعہ
سنہری لفٹ اوپر میرے کمرے پر پہنچا دیا ۔ کمرے میں گلاب کے انبار
موجود تھے اور فواکہات اور خشک میوے اور دیگر اشیاء تے نفیس ۔ شاہی

پارٹی کے افراد کی ہوٹل شاہ عباس جتنی خاطر مدارت کرتا کم تھا۔

میں نے دریچے کے پردے سرکا کر اپنے پسندیدہ صحن چمن پر نظر ڈالی۔ چاند اوپر آچکا تھا۔ صحن کے چاروں طرف مہمان سرائے کی محرابوں والے دالان نما کمروں سے روشنیاں چھن رہی تھیں۔ گل چمن میں فوارے جاری۔ برابر چھت کی دوسری طرف اسی مشہور مذہبی مدرسے کا نیلا گنبد چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ جہاں میں نے پچھلی مرتبہ جانا چاہا تھا مگر نہ جا سکی تھی کہ وقت کم تھا۔

مجھے اپنے کمرے میں پہنچے پندرہ بیس منٹ ہوئے تھے کہ آقائے مسعود بارزین کا فون آیا۔

علیا حضرت آپ کو یاد فرماتی ہیں۔ وہ ہوٹل سے ملحق زیر تعمیر بازار کے معائنے کے لیئے تشریف لے گئی ہیں آپ بھی وہیں آجائیے۔

ہوٹل کے نزدیک ایک قدیم مسقّف بازار کو جو صفوی کارواں سرائے کی ملحقہ تجارت گاہ رہی ہوگی۔ دوبارہ علیا حضرت کی زیر نگرانی تعمیر کیا جا چکا تھا اب اس کی آرائش کی جا رہی تھی ٹپکل مڈل ایسٹرن مسقّف بازار جہاں مغربی سیاحوں کے لیئے ایرانی مصنوعات فروخت کی جائیں گی۔ علیا حضرت بحیثیت ایک آرکی ٹیکٹ اس عمارت کے معماروں سے چند ٹیکنیکل نکتوں پر تبادلۂ خیالات کرتی اس کی گلیوں میں گھوم رہی تھیں۔ اب ڈنر کے بعد شاہ عباس کے میکدے میں افسانہ خواں سے شاہنامہ فردوسی سنیں گی۔

ہوٹل میں امریکن اور یوروپین سیاح ادھر ادھر کھڑے منہ کھولے

یہ سب نظارے دیکھ رہے تھے۔ طعامِ شب کے بعد شاہ و شاہ بانو صحن کے دوسرے سرے پر روایتی میکدے میں جا کر بیٹھے۔
روایتی پوشاک میں ملبوس افسانہ خواں نے ڈرامائی انداز کے ساتھ ایک جھاڑی کے پیچھے سے نکل کر شاہنامہ سنانا شروع کیا۔
اہلِ ایران اپنی تاریخ کو RE-CREATE کرنے کا فن سیکھ گئے ہیں۔ شہبانو نے سارے ملک میں میڈیول سراؤں، چائے خانوں اور مدرسوں اور حماموں کو دوبارہ تعمیر کروا کر ان کو MODERNISE کر دیا ہے۔ طہران میں ایک روز میں ڈاکٹر کمال پاشا بہادری کے دفتر میں موجود تھی جب شہبانو کا فون آیا۔ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ کاشان میں ایک نئی سڑک بنانے کے لئے ایک قدیم تاریخی عمارت کو نقصان پہنچایا گیا ہے ان لوگوں کو فوراً منع کرو کہ اس عمارت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اسی طرح شیراز پرس پر ان کلچرل فیسٹیول میں جہاں ساری دنیا کے نامی فنکار جمع ہوتے ہیں، ایران کا روایتی PASSION PLAY (تعزیہ جس میں واقعہ کربلا کو بطور تمثیل پیش کیا جاتا تھا)، جدید ترین اسٹیج تکنیک کے ساتھ ایک یونانی ٹریجڈی کو لرزہ خیز عظمت کے ساتھ ایرانی اداکار بین الاقوامی مجمع کے سامنے اسٹیج کرتے تھے۔
شیراز فیسٹول بھی شہبانو نے اپنی نگرانی میں شروع کرایا تھا
صبح کو ہم لوگ اصفہان سے باہر جانے کے لئے فوئیر میں جمع تھے۔ ایک گیلری میں انیسویں صدی ایران کے بڑی بڑی یوروپین لیتھوگراف تصاویر کے نیچے صوفے پر چند امریکن بڑھیاں شاہی جوڑے کو دیکھنے کیلئے

چوکس بیٹھی تھیں۔ اوپر ایک بالکنی جس کے پیچھے رائل سویٹ تھا۔ تروتازہ منوں گلابوں سے بھر دی گئی تھی۔

ہز اکسلینسی ڈاکٹر بہادری حضرت علیؑ کی تصویر لیے پھر ساتھ ساتھ چلے۔ باہر سڑک پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ شاہی قافلہ اصفہان سے باہر فولاد کے کارخانے کی سمت روانہ ہوا۔ کارخانہ روسی تعاون سے بنایا جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر شاہ نے ہیلمٹ پہنی اور جیپ میں بیٹھ کر کارخانے کا معائنہ شروع کیا۔ میں پچھلی کار میں آقائے عباس ہویدا وزیر اعظم اور ڈاکٹر بہادری کے ساتھ بیٹھی تھی۔ عباس ہویدا کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا اور انگریزی اچھی بولتے تھے۔

کارخانے میں روسی سربراہ اور انجنیئر پرانی یوروپین کرٹسی کے ساتھ ایک بادشاہ سے جھک، جھک کر گفتگو کر رہے تھے۔

بین الاقوامی سیاست

اصفہان سے باہر ایک پہاڑی۔ ہم سب شاہ کے ہیلی کاپٹر کا انتظار کر رہے تھے۔ عباس ہویدا جو پورک پائی ہیٹ اور چھڑی ہاتھ میں لیے ایک کنزرویٹو انگلش جنٹلمین معلوم ہوتے تھے۔ ٹہل ٹہل کر شاہ کے انتظار میں مصروف تھے۔ مادام ریحانی میرے ساتھ کھڑی تھیں۔ میں نے پوچھا:

"آپ یہیں اصفہان میں رہتی ہیں؟" کہنے لگیں "نہیں میں بھی طہران سے آئی ہوں۔"

"وہاں آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں۔"

"وہ وزیرِ آب و برق ہیں۔" ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

شاہی ہیلی کاپٹر آگیا۔

ہم سب پھر کاروں میں سوار ہو کر زائندہ رود کے ڈیم پر پہنچے۔ نئے بجلی گھر کے اندر دیواروں پر موڈرن آرٹ کے فریسکو۔ ایک نوجوان فوجی انجنیئر ایک طرف اٹینشن کھڑا تھا۔ شاہ نے ڈیم پہ جا کر سوئچ دبایا۔ یک لخت ایک زور دار آبشار کی طرح پانی نیچے گرنے لگا۔

عمارت کے اندر ایک دریچے میں، آقائے اسد اللہ عالم کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ "زائندہ رود۔ آبِ حیاتِ نو۔" انہوں نے کہا۔

"اسی تخیل کو بائبل میں LIVING WATERS کہا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اسد اللہ عالم نے کوئی باموقع شعر پڑھا۔ اسی وقت شاہ کمرے میں داخل ہوئے۔ اسد اللہ عالم منسٹر آف کورٹ نے خاموش ہو کر نظریں جھکالیں۔ میں نے بھی خاموش ہو کر نظریں جھکالیں۔ آدابِ شاہی۔ ایک جمہوری معاشرے کے پروردہ انسان کے لئے یہ سارے آداب و ضوابط عجیب اور دلچسپ تھے۔

ڈیم غالباً فرینچ تعاون سے تیار کیا گیا تھا۔ اب شہنشاہ ایران دریا کے پختہ کنارے پر فرانسیسی سربراہوں اور انجنیئروں سے فرینچ میں گفتگو کرتے شامیانے کی طرف جا رہے تھے۔ ایرانی کی طرح فرانسیسی

بھی تہذیب و ثقافت اور نفاست کا پتلا ہوتا ہے لہذا ہر فرانسیسی MAJESTE کہہ کہہ کر دوہرے ہوتے ہوئے ان کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔

زرنگار شامیانے کے نیچے دو سنہری کرسیاں۔ درباریوں اور وزیروں کی کرسیوں کی قطاریں ان کے پیچھے۔ شامیانے کے باہر دھوپ میں ایرانی کارکنوں اور فرانسیسیوں کی بھیڑ۔ میں ڈاکٹر بہادری کے ساتھ ایک طرف کو کھڑی تھی۔ سنہری کرسی پر بیٹھ کر شاہ نے مجھ پر نظر ڈالی اور ایک افسر کو اشارہ کیا۔ وہ لپکا ہوا آیا اور مجھے اپنے ساتھ لے جاکر شاہی کرسیوں کے پیچھے ایک کرسی پر بٹھال دیا۔ فرانسیسی خواتین نے گردنیں بڑھا بڑھا کر میری ساری پر نظر ڈالی۔

رات کو اصفہان کے ایک تھیٹر میں مزاحیہ ڈرامہ۔ شاہ و شہبانو کی کرسیاں سب سے آگے رکھی تھیں۔ خانوم ریحانی جواب بحکم علیا حضرت میری دوسرا اتھ کر رہی تھیں۔ کہنے لگیں "اصفہانی اپنے حسِ مزاح کے لئے سارے ایران میں مشہور ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تمثیلیں بے حد دلچسپ ہوتی ہیں۔"

اصفہان سے شاہی پارٹی ایک بار پھر ایک مہیب فوج بردار طیارے میں طہران روانہ ہوئی۔ طیارہ حسبِ معمول شہنشاہ آریہ مہر خود پائلٹ کر رہے تھے اور حسبِ معمول معاون ہوا باز کے بغیر۔ شہبانو پہلے کی طرح کوک پٹ میں شاہ کے ساتھ اور ہم سب، اندر فوجی BUNKS میں۔

چند روز بعد رمیش سنگھوی لندن سے طہران آئے۔ ایک شام ہم مسٹر رحمن سفیر ہند کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ رمیش کا رخ نیاوران سے سیدھے وہیں آ گئے اور آتے کے ساتھ ہی بولے۔ شہبانو بے حد خوش ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ میری سوانح نگار سے میرا مکمل RAPPORT قائم ہو گیا ہے۔ وہ میرے کردار اور مزاج اور خیالات کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ میرے متعلق یہ کتاب بہت اچھی رہے گی۔ میں نے شہبانو کو بتایا کہ میں اسے امریکہ میں COLLIERS یا HARPERS میں SERIALISE کرنے کی بات چیت کر رہا ہوں۔

۵۔ شاہنامہ اور کنٹری کلب

طہران کا نیا موزیم آف موڈرن آرٹ دنیا کے سب سے بڑے نوادر خانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ایک شام شہبانو اس کا افتتاح کرنے والی تھیں۔ جدید ایرانی سنگ تراش اور مصور جو زیادہ تر پیرس میں رہ چکے تھے ہر میجسٹی کے انتظار میں باہر ایک قطار میں کھڑے تھے (ان ہی میں ایوننگ گاؤن پہنے آقائے مسعود بازرین کی بے انتہا حسین خانم مہین بھی شامل تھیں جو حکومتِ ہند کی دعوت پر ایک سال شانتی نکیتن میں بھی گزار آئی تھیں۔)

"میں فن کاروں اور ادیبوں کی معیت میں خود کو بہت ایٹ ہوم محسوس کرتی ہوں۔" ایک بار شہبانو نے مجھ سے کہا تھا۔ "چند آرٹسٹ مجھے یور میجسٹی کی بجائے فرح خانم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ کیونکہ مجھے اپنی برادری

کی ایک فرد سمجھتے ہیں۔"

میوزیم کی طویل ایر کنڈیشنڈ گیلریوں میں دو رویہ دیوار دوز دریچوں میں ایران کے مختلف ادوار کے نوادر رکھے تھے۔ ڈپلومیٹک کور کے چند مغربی اراکین جو علیاحضرت کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ زمانۂ قبل از تاریخ کے سفالی ظروف کے سامنے ٹھٹھک کر ان کو بے حد دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ ایک ہمسایہ ملک کے ڈپلومیٹ کی بیوی نے جو میرے نزدیک کھڑی تھیں بآواز بلند پنجابی میں کہا "یہ لوگ بھی کتنے بیوقوف ہیں ان پرانے دھرانے کچے گھڑوں کو دیکھ کر پاگل ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے مٹی کے برتن تو ہمارے ہاں اب گاؤں میں بھی استعمال نہیں کئے جاتے۔"

ان کے شوہر نے ان کو اشارۃً منع کرنا چاہا مگر وہ بھی پچھلے میرے ٹرپ کے ساتھ مشرقی ہند والے پترکار کی بہن نکلیں، زور سے بولیں "اور برتن بھی ٹوٹے پھوٹے۔ ایک بھی سالم نہیں۔ ان کو اتنے بڑے میوزیم میں سجانے کی کیا ضرورت تھی؟"

مجمع آگے بڑھا۔ ایک کمرے میں شاہنامے کے قدیم نسخے رکھے تھے۔ شہبانو ان کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ ایرانی موڈرن آرٹ کا سیکشن بے انتہا، حد سے زیادہ موڈرن تھا۔ ایک جگہ ایک باقاعدہ انجن سا چھک چھک کر رہا تھا۔ لوہے کے ٹکڑوں کے ملغوبے سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں پوچھوں ہوں پھر اسے آرٹ کیوں کہو، مشین ٹول انڈسٹری

کہو۔ ایک بورے میں بھوسہ بھرا رکھا تھا۔ اس قسم کے عصری آرٹ میں خلّاقی تخیل کو زیادہ دخل حاصل ہے۔ اب اس بھوسہ بھرے بورے کو آپ کچھ بھی نام دے سکتے ہیں "انسان۔" "احمق الذی۔" "دنیا۔" "زندگی" وغیرہ وغیرہ اور آرٹ کے نقاد اس پر ایک طویل مقالہ لکھ ڈالیں گے۔

میں ایک بے حد لمبے چوڑے سفید کینوس کے سامنے کھڑے تھی جس کے ایک کونے میں چھوٹا سا سیاہ نقطہ بنا دیا گیا تھا۔ اور وہ نقطہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس کو دیکھنے کے لئے خوردبین کی ضرورت پڑتی۔ اتنے میں مسعود بارزین ہجوم کو چیرتے ہوئے قریب آتے اور کہا "علیا حضرت نے فرمایا ہے رات کا کھانا آپ ان کے ساتھ کنٹری کلب میں کھایئے اس وقت ان کے ہمراہ ہی چلئے۔"

شہبانو میوزیم سے نکل کر اپنے ہیلی کاپٹر کی طرف جا چکی تھیں۔ جو باغ کے سبزے پر کھڑا تھا۔ میں مسعود بارزین کے ساتھ باغ میں پہنچی شہبانو مع اپنے اے ڈی سی اور لیڈیز ان ویٹنگ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو رہی تھیں۔

فضائی مشین گھاس پر سے بلند ہوئی۔

"تم نے شاہنامے کے قدیم نسخے دیکھے؟" شہبانو نے مجھ سے دریافت کیا۔ نیچے طہران روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ بڑے اشتیاق اور فخر سے نیچے جھانک کر کہنے لگیں "دیکھو طہران کتنا خوبصورت ہے۔"

چند منٹ بعد ہیلی کاپٹر ایک وسیع باغ میں اترا۔ شہبانو اور میں اتر کر ایک عالی شان عمارت کی طرف روانہ ہوئے۔

برآمدے کی سیڑھی پر ایک لمبا تڑنگا وردی پوش آدمی اٹنشن کھڑا تھا۔ ہم اندر ہال میں گئے۔ شہبانو نے کہا: "اب تم ہوٹل جاکر تیار ہو جاؤ۔" وردی پوش سے کہا: "خانم کو ہوٹل لے جاکر وہاں سے کنٹری کلب لے آنا۔"

میں وردی پوش انسان کو کہر کے دھندلکے میں شاہی شوفر سمجھی۔ میں نے کہا: "ہاں آپ مجھ کو پہلے ہلٹن لے چلئے۔" پھر میں نے شہبانو سے پوچھا: "اب آپ اپنے گھر جاکر تیار ہوں گی؟"

ذرا جھینپ کر انکسار سے جواب دیا: "یہ ہمارا ونٹر ہوم ہے۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اچانک مجھے یاد آیا ارے یہ تو کاخِ نیاوَران ہے۔ جہاں میں دن میں کئی مرتبہ آئی تھی۔ اور شاہ و شہبانو چند روز قبل کاخ سعد آباد سے منتقل ہو کر موسم سرما کے لئے یہاں آچکے تھے۔

شہبانو اوپر چلی گئیں۔ ایک لیڈی ان ویٹنگ نمودار ہوئی: "آپ میک اپ وغیرہ یہیں کر لیجئے۔ ہوٹل جاکر ساری تبدیل کر لیجئے گا ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

وہ مہمان خانے کے ڈریسنگ روم میں لے گئی۔ سنگھار میز پر جو برش اور کنگھیاں اور پاؤڈر باکس وغیرہ رکھے تھے ان سب پر ہیرے، زمرد اور یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ میں باتھ روم میں گئی۔ سوچا یہاں شاید ساری چیزیں خالص سونے کی ہوں گی مگر وہ عام چینی کی نکلیں۔

باہر برآمدے میں وردی پوشش اسی طرح اٹنشن کھڑا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا۔ اب جو دیکھا تو کار ایک اور شخص چلا رہا تھا اور یہ باوردی شخص جو غور سے اس کا یونیفارم دیکھا تو پتہ چلا کہ ایک اعلےٰ فوجی افسر تھا۔

کنٹری کلب کہرے میں ملفوف تھا۔ اندر ایک منزل پر چند معمّر ایرانی امیرزادیاں ایک میز کے گرد برج میں مستغرق تھیں۔ اوپر ایک اور کمرے میں شاہی مہمان مع مادام فریدہ دیبا شہبانو کے منتظر تھے۔ جس وقت علیا حضرت کمرے میں داخل ہوئیں ان کی والدہ بھی تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔
شہبانو نے ایک جنرل صاحب سے ملوایا جو ان کے ایک ندوئی تھے۔ کہنے لگیں: "یہ تمہاری کتاب کے فرنچ اور جرمن اڈیشن کی دیکھ بھال کریں گے۔"

باتوں باتوں میں میں نے شہبانو سے کہا آپ نے سابق ملکہ ثریا کی کتاب پڑھی ہے جو چند سال ہوئے ولایت میں چھپی ہے؟ انہوں نے اس کتاب میں شاہی خاندان پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔"
"پرنسس ثریا ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہیں لیکن ان کو ایسی باتیں نہیں لکھنی چاہیئے تھیں۔ مغربی پریس خود میرے متعلق طرح طرح کی خبریں چھاپتا رہتا ہے ایک مغربی رسالے نے لکھا کہ میں ایک صحرائی محل میں جا کر جادوگرنیاں جمع کرتی ہوں اور ان سے جادو ٹونے کرواتی ہوں۔ مغرب کے لیئے ہم مشرقی اب تک ایک پر اسرار شے ہیں۔"

گویہ کنٹری کلب مشرقی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد دوسرے کمرے میں ڈنر شروع ہوا۔ شمپین کا دور چلا۔ کمرے میں شہبانو کے قریبی دوست انٹرنیشنل جٹ سیٹ کے چند افراد موجود تھے۔ ایران کی اعلےٰ ترین سوسائٹی اپنی شامیں اسی طرح گذارتی تھی۔ بیش قیمت ہیرے، ہنک کونٹ، یورپ کی اعلےٰ ترین تفریح گاہوں کے تذکرے۔ کنٹری کلب کے باہر رات گہری ہوتی گئی اور دھند۔

۶۔ شاہی بالکنی

"ایران ہمیشہ سے پہلوانوں کا ملک رہا ہے۔ آج بھی جگہ جگہ زور خانے موجود ہیں جہاں دنگل ہوتے ہیں۔ رضا شاہ کبیر نے ایران کی تجدید نو کرتے ہوئے نوجوانوں کی تربیت بدنی پر بہت زور دیا تھا۔ خود سپاہی آدمی تھے۔ یہاں کے اسپورٹس اور ورزشی مظاہرے جو ہزاروں کی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ دکھاتے ہیں، واقعی حیرت انگیز ہیں۔" راشد صاحب نے کہا۔

ہم لوگ لنچ کے بعد قہوہ پی رہے تھے۔ پاکستان فارن سروس کے محبوب خزاں (جو ایک نفیس اور حساس شاعر اور نہایت معقول انسان ہیں) یورپ جاتے ہوئے چند روز کے لئے طہران آ گئے تھے اور راشد صاحب کے ہاں مقیم تھے۔

میں نے سپاہ دانش کے مظاہرے کا وقت دیکھنے کے لئے پرس سے کارڈ نکالا۔ لفافے پر حسبِ معمول لکھا تھا "سرکار خانم قرۃ العین حیدری۔"

"اب معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں لفظ سرکار کا پُر تکلف استعمال کہاں سے آیا۔" میں نے کہا۔ مگر یہ لوگ مجھے ہمیشہ حیدرّی کیوں لکھتے ہیں؟"

"مجھے ہمیشہ راشدی لکھتے ہیں" آغا نے راشدی۔" راشد صاحب نے جواب دیا۔

میں نے کارڈ پر نظر ڈالی:

توانا بود ہر کہ دانا بود

وزارت آموزش و پرورش

در پیش گاہ مبارک اعلے حضرت ہمایوں شہنشاہ آریہ مہر علیا حضرت فرح پہلوی شہبانوئے ایران۔ مراسم جشن آغاز سال تحصیلی و خالیتای سپاہ دانش در استادیوم محمد رضا شاہ پہلوی برگزار می گردد۔ وزیر آموزش و پرورش از جناب عالی خواہش مند است در ساعت ۵ بعد از ظہر روز یک شنبہ بیست و ششم مہر ماہ در مراسم مذکور شرکت فرمائید۔

لباس: تیرہ

مسقف اور FLOODLIT استادیوم کی شاہی بالکنی میں ڈاکٹر بہادری درباری لباس ٹیل کوٹ دستانے پہنے شاہی پارٹی کے منتظر تھے۔ میں استادیوم کا سارا منظر اچھی طرح دیکھنے کے لیے بحیثیت ایک چوکس جرنلسٹ بالکنی کے ایک کنارے پر ٹانگیں ٹکا کے بیٹھ گئی۔ شاہی آمد کے بعد نیچے اسمارٹ نوجے وردی پوش لڑکیوں اور لڑکوں نے پروگرام شروع کیا۔

سلام شہنشاہی۔ سرود سپاہ دانش عرض سپاس ایک سپاہی دانش۔ خطالہ

یک معظم برگے از شاہنامہ ۔ کمدنی الشادی (یعنی کومیڈی) "ہمیشہ معلم" عطا جوایز ۔

تیسرے روز امجدیہ استادیم میں تقریباً پچاس ہزار نوجوان لڑکوں لڑکیوں نے ورزشی مظاہرے کیے ۔ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ کراٹے لڑیں ۔ موٹر بائیک سوار زنانہ پولیس کی لڑکیوں نے محیر العقول کرتب دکھلائے ۔ آگ کے چکروں میں سے اپنی موٹر سائیکلیں کو دا کر لے گئیں ۔ زنانِ ایران کی یہ ترقی واقعی قابلِ تعریف تھی اور اس کی شروعات رضا شاہ کبیر نے کی تھی ۔

اس کے بعد سازمان تربیت بدنی و تفریحات سالم ایران جشن فرخندہ زاد روز مبارک علیا حضرت شاہ بانوئے گرانمایہ ایران استادیوم ورزشی فرح پہلوی ۔ ۲۵ مہر ماہ ۱۳۴۹ شمسی لحوظہ دبیرستان شاہ کبیر ۔

دوپہر کو میں اپنے کمرے میں تھی ۔ ڈاکٹر بہادری کا گھبرایا ہوا فون آیا ۔ "آپ ابھی تک نہیں آئیں ، شہبا تو استادیم میں نزول اجلال کر چکی ہیں ۔" جلدی سے تیار ہو کر نیچے گئی ۔ وزارت اطلاعات و نشریات کی کار مع شوفر چوبیس گھنٹے ہلٹن پر میرے لئے موجود رہتی تھی ۔ فوراً استادیم کا رخ کیا ۔ وہاں سب پھاٹک بند ہو چکے تھے ۔ پولس کا کڑا پہرا ۔ دعوت نامہ بھی ساتھ لانا یاد نہیں رہا تھا ۔ دوسرے پھاٹک پہ جا کر میں نے کھل جا سم سم والے طلمی الفاظ یاد کیے ۔ "مہمون علیا حضرت ۔" دروازہ فوراً کھل گیا ۔ مہمون یعنی مہمان ۔ اہل طہران الف کی جگہ واؤ پیش بولتے ہیں ۔ نان کے بجائے نون قربان کے بجائے قربون وغیرہ ۔ اندر جم غفیر میں سے ایک درباری افسر

لپکے ہوئے برآمد ہوئے۔ ”آپ کا منتظر تھا۔ تشریف لے چلیے۔“

اور پہ شاہی بالکنی میں فرح پہلوی۔ ان کے پیچھے چند لیڈیز ان ویٹنگ اور ڈاکٹر بہادری۔ علیا حضرت کے برابر والی کرسی میرے لئے خالی تھی تاکہ حسب معمول بسلسلہ تصنیف کتاب اپنی سوانح حیات اور خیالات کا تذکرہ کرتی رہیں۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اس میں سارے ایران کے زنانہ کالجوں اور اسکولوں کی لڑکیاں حصہ لے رہی تھیں۔ اس وقت شہبانو کے سان وگمان میں نہ تھا کہ یہی طلبا و طالبات اور ان کے آنے والے دانش جو شہنشاہیت کے خلاف اس قدر تاریخ ساز جد و جہد کا آغاز کریں گے، ان کی تصاویر نذر آتش کریں گے۔ مرگ بر شاہ کے نعرے لگائیں گے اور خوشی خوشی مشین گنوں کا نشانہ بنیں گے اور یہ موٹر بائیک سوار اور KARATE کرنے والی لڑکیاں قومی جد و جہد کے سمبل کے طور پر سیاہ چادریں اوڑھ کر اس انقلاب میں شامل ہوں گی۔ یہ ایشیا کا واقعی ایک حیرت انگیز انقلاب ہے اس وقت بالکنی میں بیٹھی شہبانو مجھ سے تو یہی کہہ رہی تھیں کہ وہ خود مڈل کلاس طالب علم لڑکی سے ملکہ ایران کس طرح بن گئیں۔ ان کو اس وقت معلوم نہ تھا مجھ سمیت بہت سوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ نئی مڈل کلاس لڑکیاں آٹھ سال بعد شہنشاہیت کے خلاف مورچہ لگا کر طہران کے اس میدان میں گولیوں کا نشانہ بن جائیں گی جسے اب ایرانی ”شکارگاہ شہنشاہی“ کہتے ہیں۔ تو واپس چلئے فرح سٹیڈیم۔

نواختن سلام شاہنشاہی۔ خواندن سرود راد روز توسط دانش آموزان

دبیرستان کوشش بریم۔ اژدہ ورزشگاران۔

اس وقت "پیرامید دختران دانش جوئے موتور سوار شہربانی" ہو رہا تھا پھر حرکات دست جمعی دانش آموزان دبیرستان مہر باختر وژیمناستک دستجمعی نوآموزان شبانہ روزی شمارہ ۲ فرح پہلوی" کے بعد "برنامہ موزون دانش آموزان دبیرستان ژاندرک" (یعنی کانونٹ آف جون آف آرک) شروع ہو گیا۔ بچیوں کا دستہ جھنڈا لئے ملکہ کو سلامی دیتا آگے بڑھا۔

اسس وقت شہبانو نے مجھ سے کہا: "میں تقدیر کی قائل ہو چکی ہوں۔ DESTINY۔ ایک وقت تھا جب یہ سٹیڈیم ثریا سٹیڈیم کہلاتا تھا اور میں بعمر ۱۲ سال اپنے اسی اسکول ژندارک کے دستہ کا جھنڈا اٹھائے ملکہ ثریا کو سلامی دیتی اسی بالکنی کے سامنے سے گذری تھی اور وہ اسی جگہ اسی کرسی پر بیٹھی مظاہرہ ملاحظہ کر رہی تھیں۔

۷۔ کیپٹن سہراب دیبا۔

کیپٹن سہراب دیبا تبریز (صوبہ آذربائیجان) کے ایک قدیم زمیندار علوی سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ طبرستان ۸۶۴ء میں خلافتِ بغداد سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہاں حسن بن زید نے خود کو داعی الکبیر کہلوا کر اپنی حکومت قائم کی دیبا خاندان غالباً بعہد داعی الکبیر آذربائیجان میں آباد ہوا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ امام حسنؑ کے ایک داماد تھے اور ہمیشہ دیبا کی پوشاک پہنتے تھے اس وجہ سے ان کا خاندان دیبا کہلانے لگا۔

۱۷۳۶ء میں عہد صفویہ کے خاتمہ اور عہد قاچاریہ کے آغاز کے ساتھ ایران کا زوال شروع ہوا۔ گو ناصرالدین شاہ قاچار کے دانشمند وزیر امیر کبیر ملک کی ترقی کے لئے بہت کوشاں رہے۔ انہوں نے ۱۸۵۱ء میں طہران میں ایک یوروپین طرز کا دارالعلوم قائم کیا۔ نوجوان طلباء کو لندن، پیرس، قسطنطنیہ اور سینٹ پیٹرز برگ برائے اعلیٰ تعلیم روانہ کیا اور اپنی ترقی پسندی کے صلے میں قتل کئے گئے۔ ایران روسی اور یوروپی حلقہ ہائے اثر میں بٹ چکا تھا۔ شمال میں روس، جنوب میں برطانیہ جہاں تیل نکل رہا تھا۔ ناصرالدین شاہ قاچار روسیوں کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ۱۸۷۵ء میں انہوں نے روسی کوزیگ بریگیڈ COSSACK BRIGADE کے ماڈل پر PERSIAN COSSACK BRIGADE کی تشکیل کی۔ اس کے اعلےٰ افسر تمام روسی تھے۔ نوجوان ایرانی فوجی افسر اعلےٰ تربیت کے لئے روس بھیجے جانے لگے۔

اسی زمانے میں تبریز کے دیبا خاندان کے ایک بزرگ عالم اور مورخ نظام العلماء نے اپنے بیٹے مہدی دیبا کو ماسکو کی ملٹری اکیڈیمی میں بھیجا۔ ماسکو سے واپس آکر مہدی دیبا نے اپنی ایک کزن سے شادی کی۔ ان کو شجاع الدولہ کا خطاب بھی ملا اور یورپ کے کئی ممالک میں بطور سفیرِ ایران متعین رہے۔

اس زمانے میں ایران کی حالت دگرگوں ہو چکی تھی۔ شاہ ناصرالدین (۱۸۴۷ء - ۱۸۹۶ء) کے حرم میں ایک ہزار سات سو عورتیں تھیں۔ ان کے

جانشین اور فرزند مظفر الدین شاہ قاچار نے صرف چونسٹھ پر اکتفا کیا۔ شاہ ناصر الدین کو ۱۸۹۶ء میں قتل کیا گیا۔ مظفر الدین اس وقت آذربائیجان کے گورنر تھے۔ تبریز میں مراسم تاج گذاری ادا ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں موصوف بغرض سیاحت یوروپ گئے اور وہاں عیش وعشرت میں اس قدر روپیہ اڑایا کہ حکومت ایران کا دیوالیہ نکل گیا اور ملک کا انتظام چلانے کے لئے حکومت کو روس سے بھاری قرض لینا پڑا۔

شجاع الدولہ مہدی دیبا کے ہاں سہراب اور بہرام کی پیدائش کے بعد ان کی خانم نے ان سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لی (مسلمان عورتوں کا طلاق حاصل کر کے دوسری شادی کرنا صرف اس برصغیر میں معیوب سمجھا جاتا ہے) ۱۹۱۱ء میں مہدی دیبا نے سہراب اور بہرام کو ماسکو کی اسی ملٹری اکیڈمی میں بھیجا جہاں انہوں نے خود پڑھا تھا۔

۲۶ نومبر ۱۹۱۷ء کے روز سہراب اپنے کلاس روم میں مصروف مطالعہ تھے جب پیٹروگراڈ سے خبر آئی کہ لینن نے ونٹر پیلیس پر قبضہ کر لیا۔ مہدی دیبا کا ایران سے تار پہنچا کہ فوراً روس سے روانہ ہو جاؤ۔ دونوں بھائی مختلف خطرناک ایڈونچرز کا سامنا کرتے ماسکو سے بذریعہ ٹرین پیرس پہنچے۔ وہاں سہراب دیبا نے سوربون میں قانون پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ SAINT CYR کی ملٹری اکیڈمی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں وطن واپس آئے۔

اس اثنا میں پرشین کوزیک بریگیڈ کے کرنل رضا خاں احمد شاہ

قاچار کو معزول کر کے پہلے وزیر جنگ اور اب خود شہنشاہ بن چکے تھے۔ اور اتاترک کی طرح اپنے ملک کو جدید بنانے میں کوشاں تھے۔ سہراب دیبا فوج کے شعبہ قانون میں شامل ہو کر طہران میں تعینات کئے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں فوج سے مستعفی ہو کر بنک آف انڈسٹریز میں ملازم ہو گئے۔ اسی سال ان کے والد شجاع الدولہ مہدی دیبا نے جو ہالینڈ میں ایران کے سفیر تھے انتقال کیا۔ کچھ عرصے بعد کیپٹن سہراب دیبا نے مادموزیل فریدہ قطبی سے شادی کر لی جو طہران کے فرانسیسی کانونٹ ژاندرک کی تعلیم یافتہ تھیں۔

مادام فریدہ دیبا اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ کاخ سعد آباد کے احاطہ میں رضا شاہ کبیر کے بنوائے ہوئے ایک نہایت خوب صورت محل میں رہتی ہیں۔ شام کا وقت ہے اور باغ میں جگہ جگہ درختوں اور پھولوں کو منور کرنے کے لئے گھاس میں آرک لائٹس لگی ہوئی ہیں۔ اندر وسیع ایوانِ نشست کی پوری چھت پلیٹ گلاس کی ہے۔ اوپر رات کا گہرا نیلا آسمان نظر آ رہا ہے (شاہی خاندان کے رہن سہن پر لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں اور شاہ کے سسرالی رشتہ داروں پر بھی) مادام دیبا کہتی ہیں:
"رمضان شریف آنے والے ہیں اور میں اس کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ تم روزے رکھتی ہو؟" پھر وہ ایک منقش صندوقچہ منگوا کر اپنی چند پرانی تصاویر دکھلاتی ہیں۔

ہم لوگ بھی شمالی ایران صوبہ گیلان کے شہر لاہیج کے رہنے والے ہیں

ہمارا خاندان مولویوں کا گھرانہ تھا۔ میرے دادا نے لاہیجان میں ایک بڑا حسینیہ (امام باڑہ) تعمیر کروایا تھا۔ میرے والد کا سرکاری خطاب امجد السلطان تھا۔ والدہ احترام السلطانہ کہلاتی تھیں۔"

سنہرے بالوں والی اور مغربی پوشاک میں ملبوس مادام فریدہ دیبا ایک دوسری دنیا کا تذکرہ کر رہی تھیں۔" لاہیجان میں ہمارا بہت بڑا پرانا مکان تھا۔ عورتیں شدید پردے میں رہتی تھیں۔ میں تین سال کی تھی جب میرے والدین لاہیجان سے آکر طہران میں خیابان سٹریٹ پر رہنے لگے۔ جو اس زمانہ میں ایرکیہ کہلاتی تھی۔ میرے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ماموں محمد علی قطبی کے ہاں رہی جو شہر کے نامور آرکیٹکٹ تھے۔ دوسرے ماموں فوج میں جنرل تھے۔ ہم لوگ کاخ سٹریٹ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ سہراب دیبا اپنے والد کے ساتھ پہلوی ایونیو میں مقیم تھے۔ شادی کے بعد وہ بھی ہمارے کاخ سٹریٹ میں منتقل ہو گئے۔"

اپنے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے مادام دیبا نے رومال سے آنکھیں خشک کیں۔

اتوار کے بجائے جمعہ ایران میں چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ جمعرات ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے روز کیپٹن سہراب دیبا بنک آف انڈسٹریز میں اپنے دفتر میں بیٹھے اخباروں پر سرسری نظر دوڑا رہے تھے اور امریکن ہسپتال بار بار فون کرتے تھے۔ نمبر مصروف ملتا تھا۔ اخبار پر پھر نظر ڈالتے۔ اطلاعات انٹرنیشنل ایڈیشن

نے میونخ کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا۔ ہٹلر اور چیمبرلین کے درمیان خط و کتابت جاری تھی۔ طہران سے روسی سفیر ماسکو گیا ہوا تھا۔ فلسطین میں انگریزوں، یہودیوں اور انگریزوں کے درمیان خونریز لڑائی جاری تھی۔ طہران کے قریب رضا شاہ کبیر نے ایک نئی کیمیکل لبورٹری قائم کروائی تھی۔ کیولری کے افسروں نے ایک گارڈن پارٹی منعقد کی تھی اور وزارتِ تعلیم نے اسکول کی لڑکیوں کے لئے ایک نئی وضع کی مغربی ہیٹ کا اجرا کیا تھا۔ بچی جمعہ ۱۵ اکتوبر کی شام امریکن ہسپتال میں پیدا ہوئی امریکن مشنری ڈاکٹر ملک ڈاول نے باہر آکر کیپٹن کو مبارکباد دی۔

بہت رات گئے جب کیپٹن کاخ اسٹریٹ واپس آئے سیلون میں بہت سے رشتے دار اس وقت تک جمع تھے۔ ایک خاتون اسی شام ریس کورس سے واپس آئی تھیں جہاں ولی عہد ہمایوں محمد رضا پہلوی نے عرب ترکمان اور بختیاری گھوڑوں کی دوڑ ملاحظہ کی تھی۔ ریس کورس پر ایرانی خواتین نے چوڑے چھجے والی ٹوپیاں اوڑھی تھیں جو اسی سال انگلستان کی ڈچز آف کینٹ نے ولایت کے اعلےٰ فیشن طبقے میں رائج کی تھیں۔

یہ ایران کے اوپری طبقے کی خواتین تھیں۔ بے پردہ، تعلیم یافتہ اور مغرب کی طرف دیکھنے والی۔ اور آتا ترک کی طرح رضا شاہ کبیر نے یہ نیا سماج پچھلے چند سال میں تخلیق کر ڈالا تھا۔ ملاؤں کے اثر اور خوف سے آزاد۔ لیکن نجی طور پر مذہب فراموش نہیں کیا گیا تھا۔

چند روز بعد بچی ہسپتال سے کاخ سٹریٹ لائی گئی۔ حسبِ دستور قرآن شریف کے سائے میں اسے گھر کے اندر داخل کیا گیا۔ مختلف ایرانی رسوم ادا ہوئیں۔ نام فرح رکھا گیا۔

دس روز بعد ۲۵ اکتوبر ایک اور قومی تعطیل تھی۔ ولی عہد ہمایوں محمد رضا کا جشنِ سالگرہ۔ اس برس ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے روز ولی عہد ہمایوں انیس سال کے ہو گئے۔ شام کو سارے ملک میں چراغاں۔ کاخ سعد آباد میں دعوت۔ ایک تھیٹر کمپنی نے فارسی میں اوتھیلو پیش کیا۔

(ایک سینما ہال میں سلوچنا کی ایک ہندوستانی فلم بھی جسے فارسی میں ڈب کیا گیا تھا۔ کئی ہفتوں سے چل رہی تھی۔) اس روز کے اخباروں میں ولی عہد کی تصاویر کے ساتھ یہ خبر بھی شائع ہوئی تھی کہ مصر کے شاہ فاروق کی بہن شہزادی فوزیہ سے موصوف کی نسبت طے کر دی گئی ہے۔

فرح خانم کی پہلی سالگرہ سے چند ہفتے قبل عالم گیر جنگ چھڑ گئی۔ اتحادی فوجوں نے ایران پر قبضہ کر لیا۔ چرچل اسٹالین اور روزویلٹ طہران کانفرنس کے لیے آئے۔ رضا شاہ کبیر کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا۔ انہیں برطانوی جزیرہ ماریشس جلا وطن کر دیا گیا۔ یہ ایران کے لیے بہت تاریک اور اندوہناک زمانہ تھا۔

طہران میں آب رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ گھروں میں غسل خانے نہیں تھے۔ لوگ نہانے کے لیے حماموں میں جایا کرتے تھے۔ یہ حمام ایک

قسم کے کلب بھی تھے جہاں لوگ باگ جمع ہوکر گپ شپ کرتے۔ اس زمانے میں حمام میں جہاں فرح خانم کے گھرانے کی خواتین جاتی تھیں، ایک بہت بوڑھی عورت ملازم تھی۔ وہ ہمیشہ پرانے ایرانی لوک گیت گنگنایا کرتی تھی۔ فرح خانم کو نہلاتے وہ اکثر ایک فارسی گیت گاتی جس کا مطلب تھا کہ ہم تمہیں کسی کو نہیں دیں گے۔ بادشاہ اگر اپنے وزیر اور سارے درباری اور سارے گھوڑے لے کر تمہیں اپنے محل لے جانے نہ آیا تو اسے بھی نہیں۔

"جس وقت بادشاہ اپنے سارے وزیر، سارے درباری اور سارے گھوڑے لے کر آپ کو اپنے محل لے جانے کے لئے آیا، آپ کو وہ بوڑھی عورت یاد آئی تھی؟" میں نے پوچھا:

"بہت یاد آئی۔ اس کے متعلق معلوم کروایا لیکن اتنا عرصہ گذر چکا تھا کسی کو علم نہ تھا وہ کہاں گئی۔ شاید مر چکی ہو۔ شادی کی رات جب طہران کا آسمان آتش بازی اور چراغاں سے منور تھا مجھے خیال آیا اس حمام کی وہ بوڑھی ملازمہ ممکن ہے کہیں موجود ہو اور اس آتش بازی کو دیکھ رہی ہو لیکن اسے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ جس لڑکی کی شہنشاہ سے شادی ہو رہی ہے یہ وہی بچی ہے۔ حمام میں بے شمار بچے نہلاتے جاتے تھے۔" شہبانو نے اداسی سے جواب دیا۔

شام کے وقت ہم لوگ حسبِ معمول کاخ نیاوراں کی دوسری منزل

پر ایک فرینچ اسٹائل کمرے میں موجود تھے۔ باہر کہرا پھیلا ہوا تھا۔ شہبانو سگریٹ پیتے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔

جب میں وقت مقررہ پر کاخ نیاوران جاتی تھی۔ دوسری منزل پر اس دارالمطالعے میں شہبانو ہمیشہ میز کے پاس کھڑی ملتی تھیں۔ میرے پہنچنے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھتی تھیں۔ میں نے ایک روز اس کی وجہ پوچھی کہنے لگیں۔ ملکہ ایران بننے کے بعد میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملتی ہوں جو عمر یا تجربے یا اپنے کارناموں کی وجہ سے مجھ سے بڑے یا قابلِ احترام ہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں آتا کہ جس وقت ایسے لوگ مجھ سے ملنے آئیں میں صوفے پر بیٹھی رہوں اور ایک ملکہ کے لئے احتراماً کسی کے لئے بیٹھنے سے کھڑا ہونا بھی آدابِ شاہی کے خلاف ہے۔ لہٰذا میں نے ترکیب نکالی کہ میں بعض مہمانوں کی کمرے میں آمد سے پہلے سے ادھر ادھر کھڑی رہتی ہوں تاکہ مجھے AWKWARD نہ محسوس ہونا پڑے۔"

انٹرویو کے دوران ایک درباری افسر چار پیش کر کے چلا جاتا تھا۔

اپنے والد اور اپنی آذر بائیجانی ترک دایہ منور خانم مرحومہ کا ذکر کرتے ہوئے فرح پہلوی افسردہ اور جذباتی ہو جاتی تھیں۔

" میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ بابا مجھے بے انتہا چاہتے تھے۔ صبح جب وہ دفتر جانے لگتے میں مُصر ہو جاتی کہ وہ باغ میں آ کر میرے ساتھ کھیلیں۔ لہٰذا ان کے دفتر جاتے وقت مجھے کہیں چھپا دیا جاتا تھا تاکہ وہ چپکے سے نکل جائیں۔

" اس قدر ناز و نعم میں میری پرورش ہوئی کہ بیماری، موت، دکھ اور غم کی خبریں بھی مجھ سے پوشیدہ رکھی جاتیں۔ میں نے کبھی کوئی جنازہ تک نہیں دیکھا تھا۔"

" ۱۹۴۷ء میں ایک روز بابا بیمار پڑے اور بار بار ہسپتال جانے لگے اس کے بعد ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ وہاں ان کا اپریشن کیا گیا سرطان نکلا۔ بابا اپریشن کی میز پر ہی ختم ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ستائیس سال کی تھی۔ جنازہ ہسپتال سے طہران کے متصل شہر رتے میں امام زادہ عبداللہ کے قبرستان لے جایا گیا۔

" میں کانونٹ آف جون آف آرک (ژندارک) میں پڑھ رہی تھی جہاں والدہ پڑھی تھی۔ اس روز اسکول میں اسپورٹس تھے۔ میں شام کو دیر سے گھر لوٹی۔ حسبِ معمول سکول بس سے اتر کر اچھلتی کودتی گھر میں داخل ہوئی تو سناٹا طاری تھا۔ سیلون میں چند مغموم سیاہ پوش رشتے دار موجود تھے۔ شاید وہ سب متفکر تھے کہ مجھے اس سانحہ کی اطلاع کس طرح دیں۔ میں نے تعجب سے پوچھا آپ لوگوں نے کالے کپڑے کیوں پہنے ہیں۔ وہ کہنے لگے دراصل تبریز میں ایک رشتے دار کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی چہیتی دایہ منور خانم کے لئے نظریں دوڑائیں۔ اتنے میں والدہ اور ان کے بھائی کمرے میں داخل ہوئے وہ بھی سیاہ پوش۔ وہ لوگ سیدھے قبرستان سے آرہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

انہوں نے بھی سیاہ کپڑے پہنے ہیں ؟" میں نے پوچھا۔

"لائیبج میں بھی ایک عزیز کی وفات ہوگئی ہے۔ ابھی اس کی اطلاع ملی"
ایک چچا نے کہا۔ اتنے میں مماں کمرے میں واپس آئیں تب میں نے نوٹس
لیا کہ انھوں نے سیاہ[1] ماتمی جالی چہرے پر پہن رکھی تھی۔ میں نے پوچھا بابا
کیسے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا اب بہت بہتر ہیں۔"

"ایک ماموں نے کہا۔ دراصل آج صبح ہی ان کو بغرض علاج پیرس
لے گئے ہیں۔"

صبح مجھے کیوں نہیں بتایا کہ بابا علاج کے لئے یورپ جا رہے ہیں
میں بھی ایرپورٹ جاتی۔"

" دراصل میں تمہیں بلانے تمہارے اسکول گیا تھا مگر تم کلاس میں
تھیں اور وقت بہت کم تھا۔ طیارہ جلدی جا رہا تھا۔"

" میں چپ ہوگئی مگر مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا۔ اگر یہ مجھے
اسکول بلانے جاتے تو سسٹرز مجھے ضرور چھٹی دے دیتیں کہ اپنے والد
کو ایرپورٹ پر خدا حافظ کہہ آؤں۔"

چند روز بعد مجھے معلوم ہوگیا۔ ایک دس سالہ بچے کو موت کے یہ معنی
تو معلوم ہو جاتے ہیں کہ گیا ہوا انسان پھر واپس نہیں آتا۔ مگر ایک عجیب
بات ہوئی کہ میں نے بابا کے متعلق کسی سے کوئی بات نہ کی۔ مماں سے
بھی نہیں۔ اس بارے میں بالکل چپ سادھ لی۔

---

[1] مغربی دستور

"بالو" اور "بگیرا"

"اب والدہ نے میری تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کی۔ پیانو، شہسواری پیراکی۔ ایک ٹیوٹر انگریزی پڑھانے گھر آتا تھا۔ مذہبی تعلیم بھی دی گئی۔ سارا خاندان مذہبی تھا۔ آئے دن زیارات کے لئے مختلف مقبروں پر جاتا رہتا تھا۔ اسکول میں سپورٹس میں بہت اچھی تھی اور تصویر کشی میں بھی اور قدیم شاہانِ ایران کی تاریخ بڑی دلچسپی سے پڑھتی تھی اور بے حد قوم پرست تھی۔

جس وقت سوویت یونین نے شمالی ایران پر قبضہ کیا اور نوجوان شاہ فوج کی کمانڈ کرنے محاذ پر گئے اور ایرانی آذر بائیجان روسیوں سے واپس چھین کر ظفر مند واپس آئے طہران میں فتح کا جشن منایا گیا۔ ہم اسکول کے بچے چھوٹے چھوٹے ایرانی پرچم لہراتے جاوید شاہ! جاوید شاہ کے نعرے لگاتے سڑکوں کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ بھیڑ میں سے اچک کر بھی شاہ کی سواری نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آخر میں نے ہم عمر ساتھیوں سے کہا آؤ اس گیراج کی چھت پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ چھت پر چڑھ کر ہم نے شاہ کا جلوس دیکھا اور قومی فخر اور مسرت سے بھرپور خوب نعرے بلند کئے اور تالیاں بجائیں۔

۱۹۵۰ء میں ہم اسکول کی لڑکیوں نے یہ خوش خبری سنی کہ شاہ معظم دوسری شادی کر رہے ہیں۔ ملکہ فوزیہ سے طلاق سے دو سال بعد مادموزیل

ثریا اسفندیاری سے ان کی نسبت طے پائی۔ وہ ایک طاقتور بختیاری قبیلے کے سردار کی لڑکی تھیں بے حد حسین اور سوئٹزرلینڈ میں پڑھ رہی تھیں۔ ان کی والدہ جرمن تھیں۔ اسکول میں ہم لوگ بے انتہا اشتیاق سے شادی کے متعلق ساری خبریں پڑھا کرتے۔ ان کا جہیز فرانس میں خریدا جارہا ہے۔ شادی کے لئے فلاں فلاں ملک کے بادشاہ اور صدر مملکت آئیں گے وغیرہ۔ یہ سب پڑھ کر ہم کو بے حد خوشی اور اکسائٹمنٹ ہوتا۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ایک بار پھر میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑی تہنیتی نعرے لگا رہی تھی۔ شاہی دولہا دلہن کی موٹر سامنے سے گذری۔ ان دونوں کی جھلک نظر آئی اور ہم لوگ بے حد مسرور ہوئے۔

شادی کے بعد اب ساری قوم نے ولی عہد کی پیدائش کا انتظار شروع کیا کیونکہ ملکہ فوزیہ کو بھی اسی وجہ سے طلاق ملی تھی کہ ایرانی آئین کے مطابق ولی عہد کی ولادت ضروری تھی۔

ملکہ ثریا کی سالگرہ کے روز ثریا اسٹیڈیم میں میں اپنی ٹیم لیڈر کی حیثیت سے ہر امپیریل میجسٹی کو سلامی دیتی شاہی بالکنی کے سامنے سے گذری۔ اسکول کی اسپورٹس ریہرسل میں اوّل آئی تھی۔ اس روز اسٹیڈیم میں میرا تیسرا نمبر تھا۔ مجھے بے حد مایوسی ہوئی اور اپنے اوپر غصہ آیا۔ افسوس سب سے زیادہ اس بات کا تھا کہ علیا حضرت

کے ہاتھ سے مجھے تمغہ نہیں ملے گا۔ جب میں گھر پہنچی تو مجھے بخار آ گیا۔
دوسرے روز سہ پہر کے وقت کاخ سعد آباد میں اسپورٹس کے مقابلے
جیتنے والی ساری لڑکیوں کو ایک گارڈن پارٹی پر بلایا گیا تھا۔ بخار کی وجہ
سے وہاں بھی نہ جا سکی اور اس رنج اور مایوسی کی وجہ سے اور زیادہ نڈھال
ہوئی۔ اس روز بستر پر کروٹیں بدلتے بخار میں مبتلا میں نے سوچا۔ خیر
کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ ایک روز اولمپک اسٹار بن کر ایران کے
لئے طلائی تمغہ حاصل کروں گی۔ اولمپک اسٹار بننا میری سب سے بڑی
تمنا تھی۔

موسم گرما میں ہم لوگ شمران چلے جاتے تھے جہاں ہماری ذاتی ولا تھی۔
وہاں ہم سب کزن پہاڑیوں پر کھیلتے، خچروں پر سواری کرتے۔ رات کو
رستم و اسفندیار کے قصے سنتے۔ کبھی گرمیوں میں لاہیج یا تبریز جاتے۔
لاہیج کے چائے کے باغات میں کام کرنے والوں کا ہاتھ بٹاتے۔ شہسواری
کرتے اور رات کو گھر کے بڑے بوڑھوں سے شاہنامہ یا مثنوی شیریں
خسرو سنتے۔ اکثر زیارت کے لئے مشہد مقدس جاتے۔
طہران آج جیسا موڈرن نہیں ہوا تھا اور ہمارا گھرانہ کافی قدامت پسند
تھا۔ لہٰذا ہم لوگوں کا "ڈیٹ" کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
میں اور میری سہیلیاں امریکن مغنیوں کے گانے ٹیپ کر کے فون پر
ایک دوسرے کو سناتے یا ایک دوسرے کے ہاں پارٹیوں میں
چلے جاتے۔

-میں اسکول میں بہت ہر دلعزیز تھی اور میری نیک دلی اور دوسروں کے کام آنا بہت مشہور تھا۔ ایک بار میں نے ایک غریب طالب علم کو اپنا سارا لنچ پیک دے دیا تھا۔ کم مایہ لوگوں کی مدد کرتی رہتی تھی اور گھر پہ اور سکول میں جب میری تعریفیں کی جاتیں تو میں سوچتی ہوں کہ میرے بابا کا انتقال ہو چکا ہے لوگ میرے اوپر اتنے مہربان ہیں اور میری دلجوئی کے لئے میری تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ ورنہ اتنی کم عمری میں اس قدر توصیف سے کسی بھی لڑکی کو اپنے متعلق مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرے سنس آف ہیومر نے مجھے ایک بور قسم کی نیکی کی پتلی بننے سے بچا لیا۔

۱۹۵۴ء میں میں نے اسکول کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ میں بڑی جوشیلی گرل گائیڈ بھی تھی۔ رازی اسکول اور ایک اور فرانسیسی مدرسے کے اسکاؤٹ پروگرام کو ایک فرنچ راہب فادر گویا ڈائریکٹ کرتے تھے۔ انہوں نے کپلنگ کی جنگل بک کے کرداروں کے نام ہم لوگوں کو عطا کر رکھے تھے میں بالو (بھالو) کہلاتی تھی اور میری سہیلی لیلیٰ بگیرا (بگھیرا) ڈاکٹر البرٹ شوئٹزر میرے آئیڈیل تھے۔

۲۱۔ مارچ جشن نوروز ہمارا تہوار ہے۔ اس روز لوگ دربارِ شاہی میں سلامی کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ میرے ایک چچا اعلیٰ حضرت کے چیمبرلین تھے۔ ہر سال سلامی کے روز ہز میجسٹی اپنے اراکینِ دربار کو سلامی کے وقت ایک ایک پہلوی (اشرفی) عطا کرتے تھے۔ چچا وہ اشرفیاں لا کر مجھے

دے دیتے کہ بطور نیک شگون ان کو اپنے پاس رکھو۔ اس طرح میرے پاس بہت اشرفیاں جمع ہوگئیں۔

۱۹۵۶ء میں رازی اسکول سے (جہاں میں ژندارک کے بعد داخل ہوئی تھی) میں نے تعلیم مکمل کی۔ گھر کے بزرگوں نے طے کیا کہ میں پیرس جاکر فنِ تعمیر کی تربیت حاصل کروں۔ پیرس روانگی سے قبل صبح کو میں نے اپنی والدہ سے کہا شام کو میرے کمرے میں آیئے گا۔

" والدہ ذرا متعجب ہوئیں کیونکہ میں جذباتی اور اسرار پسند کبھی نہیں تھی۔ شام کو جب وہ میرے کمرے میں آئیں میں نے ان سے کہا کہ یورپ روانہ ہونے سے قبل بابا کو خدا حافظ کہنا چاہتی ہوں۔

" ضرور۔ یقیناً۔" مماں نے جواب دیا۔

" لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ کیا میں منور خانم کو اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں ؟"

۱۹۴۷ء کے اس روز جب خاندان قبرستان سے لوٹ کر آیا تھا اس کے بعد آج پہلی بار میں نے بابا کا نام لیا تھا۔ منور خانم نے اپنی چادر اوڑھی اور ہم دونوں کار میں قبرستان امام زادہ عبداللہ گئے۔ اسی شام میں پیرس روانہ ہوگئی۔

۹۔ ہالینڈ، لیبین۔ پیرس

۱۹۵۶ء کے اکیڈمک ٹرم کے آغاز میں نوجوان ایرانی لڑکیاں

CITE UNIVER STAIR میں وارد ہوئیں جو پیرس کے نزدیک
طلباء کا بین الاقوامی مرکز ہے۔ کیمپس کے ہالینڈ پویلین میں پانچ عدد ایرانی
دانش جو اقامت گزیں ہوئے ان میں یہ تین لڑکیاں بھی شامل تھیں۔
مادموزیل مہری کمیو جیہ جو سوربون میں ریاضی پڑھنے آئی تھیں۔ مادموزیل لزا
ادبانیاں بائیو کیمسٹری کی طالب علم تھیں اور مادموزیل فرح دیبا اسکول
آف آرکی ٹیکچر میں داخل ہوئیں۔

کیمپس پر شروع شروع میں مجھ کو اسی قسم کے احمقانہ سوالات کا
سامنا کرنا پڑا جو اہل مغرب ادبا کر مشرقیوں سے پوچھتے ہیں تمہارے
باپ کے حرم میں کتنی بیویاں ہیں؟ تمہاری شادی کے وقت بطور
BRIDE PRICE تم کو کتنے اونٹ دیئے جائیں گے؟ تمہارا ریگستان
تو بے حد گرم ہوگا۔ تم لوگ خیموں میں رہتے ہو گے وغیرہ۔ دوسرا مسئلہ "ڈیٹ"
کا سامنے آیا۔ میں نے سمجھایا کہ ان کے ملک میں لڑکیاں لڑکوں کے
ساتھ ڈیٹ نہیں کرتیں۔ اس پر بھی جب لوگ مصر رہے تو میں نے
یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ وطن میں میری ایک ایرانی نوجوان کے ساتھ نسبت
طے ہو چکی ہے۔

نئے طلباء کو تنگ کرنا وہاں کا قاعدہ بھی تھا۔ دوسرے سال خود میں
نئے طلباء کو RAG کرنے کے ہنگامے میں شامل تھی۔
RAGGING ذرا زیادہ ہو گئی تھی لیطور سزا ملزموں کو دو ہفتے کے
لئے کلاس بدر کر دیا گیا تھا۔ جب ملزم واپس آئے تو ان کے ساتھیوں نے

مجاہدوں کی طرح ان کا استقبال کیا۔ ہر مجاہد کو ایک ایک تمغہ عطا کیا گیا۔ ملزم فرح خانم کو جو تمغہ ساتھیوں کی طرف سے ملا اس پر بلی کی تصویر بنی تھی۔ فرینچ زبان میں بلی LE CHAT کا تلفظ شا ہے اور یہ فرح دیبا کے ملک کے شاہ سے ملتا جلتا تھا اس وجہ سے یہ رعایت لفظی استعمال کی گئی۔

ہر سال جنوری کے مہینے میں فرینچ طلبا FEAST OF KINGS مناتے تھے۔ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ایک کیک تیار کرتے ہیں اس کے اندر دو بیج ڈال دیئے جاتے جس لڑکے یا لڑکی کے ہاتھ میں اتفاقیہ وہ ٹکڑے آتے جن سے وہ بیج نکلتے ان کو بادشاہ اور ملکہ بنایا جاتا۔ ایک جنوری میرے کیک کے ٹکڑے میں سے بیج برآمد ہوا لہذا مجھے کاغذ اور پنی کا نقلی تاج پہنایا گیا۔ جشن کے بعد میں اپنا تاج اتارنا بھول گئی اور بے دھیانی میں اسے پہنے پہنے اپنی کلاس میں چلی گئی۔ ایک مرتبہ کالج کے فینسی ڈریس ہال میں قدیم روما کی ملکہ بنی۔

میں بہت محنتی طالب علم تھی۔ رات گئے تک پڑھا کرتی۔ کھانا کالج کیفے ٹیریا میں کھایا جاتا تھا۔ ہوسٹل میں میرا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ رات کو کافی بنانے کے لئے عمارت کی سب سے اونچی منزل پر جہاں پینٹری تھی کیتلی لے جانا پڑتی تھی لہذا میں نے یہ ترکیب نکالی کہ ایک چرخی کے ذریعے ایک ٹوکری رسی سے اپنی کھڑکی کے نیچے لٹکا دیتی۔ اس میں کیتلی رکھ دی جاتی۔ نچلی منزل پر میری کمیوجبیہ اپنی کھڑکی میں سے وہ کیتلی لے لیتی۔ رسی کے دونوں طرف گھنٹیاں لگا دی گئی تھیں اور اکثر یہ "ٹیلیفون"

خفیہ پیغام رسانی کا کام بھی انجام دیتا۔

موسم بہار میں ہم تینوں ایرانی لڑکیاں نوروز منانے کے لیے "ہفت سین" کا سامان اکٹھا کرنا شروع کرتیں۔ ہفت سین میں سبزہ و سمنو و سنجد و سماق و سیر و سنبل و سرکہ شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آئینہ، قرآن، اسپند، شمعہائے رنگی، ماہیائے قرمزہ ظرف، بلور پُر آب، گل، شرینی آجیل و میوہ بھی چاہیے۔ لیکن ہفت سین کی اشیاء لازمی ہیں۔ یہ سات چیزیں ہم تینوں کئی دن پہلے سے جمع کرنا شروع کر دیتے۔ مہری کے کمرے میں ۲۱ مارچ کے روز جشن منایا جاتا۔

نوروز سے چند دن قبل مارچ کی ایک روشن صبح ہفت سین کے لیے سرکہ لانے ہوسٹل کے کیفے ٹیریا میں گئیں۔ خادمہ نے سرکہ کی بوتل دیتے ہوئے کہا، "مادموزیل! آپ نے آج کی تازہ خبر پڑھی ہے؟"

"میں نے ابھی اخبار نہیں دیکھا۔"

"یہ لیجیے۔ بڑا افسوس ہوا۔" خادمہ نے اخبار سرکاتے ہوئے کہا۔ ایک سرخی تھی:

"شاہ ایران نے ملکہ ثریا کو طلاق دے دی کیونکہ وہ لاولد رہیں۔ شاہ نے چند سال قبل ملکہ فوزیہ کو بھی اسی وجہ سے طلاق دے دی تھی کہ وہ ولیعہد کو جنم نہ دے سکیں۔"

اکثر نوعمر طلبا کی طرح رات کو سونے سے پہلے میں بھی ڈائری لکھا کرتی تھی۔ "اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہمایوں نے شہبانو کو طلاق دے دی۔ بڑے

افسوس کی بات ہے کہ ثریا تو کے ہاں ولی عہد پیدا نہ ہوا اور شاہ کو المناک قدم اٹھانا پڑا۔"

پیرس میں آج گل بہار آئی ہوئی ہے۔ ایران میں بھی موسم گل آگیا ہوگا لیکن ملکہ ثریا کے لئے یہ موسم بہار کتنا کرب ناک ثابت ہوا۔

اب فرانس کے اخباروں نے شاہ کی تیسری شادی کے متعلق قیاس آرائیاں شروع کیں۔ میرے فرانسیسی دوستوں نے مجھے چھیڑا۔ LE CHAT والا لطیفہ پھر دہرایا جانے لگا۔ اخباروں میں آ رہا تھا کہ فلاں فلاں حسین جمیل امیرزادیاں دربار میں پیش کی جا رہی ہیں۔ فلاں فلاں بین الاقوامی شہرت کی حسینہ کے متعلق خیال کیا جا رہا ہے وغیرہ۔ ایک روز ایک انگریز کلاس فیلو لڑکی نے مجھ سے مذاقاً کہا "ارے تم ہی جا کر اپنے شاہ سے شادی کر لونا۔ تم بھی تو اچھی خاصی ہو۔"

"ہاں ہماری فرح کیا بُری ہے وہ خود لاکھوں میں ایک ہے۔" ایک فرینچ لڑکی بولی۔

میں نے بھی مزاحاً جواب دیا۔ "ہاں ہاں بالکل۔ خیال بُرا نہیں۔"

اس سال گرمیوں کی تعطیلات میں ہم تینوں برٹینی کے ساحل پر گئے۔ باز کے جزیرے سے واپسی پر سمندر میں طوفان آگیا۔ تیز بارش اور ہوا کے تھپیڑے۔ کشتی پانی سے بھر گئی۔ کشتی میں سیاحوں کی بھیڑ تھی۔ تینوں پانی سے تر اور مسافروں کے دھکے کھاتے کیچڑ میں پچھ پچھ کرتے ساحل پر اتر کر کسی سرائے کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ تیز ہوا ہم کو اڑائے دے رہی تھی۔" اگر میں نے کبھی دنیا میں نام پیدا کیا یہ خوفناک دن ہمیشہ یاد رکھوں

گی۔" میں نے سردی سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ شدید بارش کی دھند کی وجہ سے راستہ بھی صاف سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بدقت تمام ہم تینوں ایک ہوٹل تک پہنچے۔ ہوٹل کے مالک اور اس کی بیوی نے ہم کو فوراً خشک کپڑے پہننے کے لئے دیئے۔ آتش دان کے سامنے بٹھال کر گرم کافی پلائی اور انتہائی شفقت کے ساتھ ہماری دیکھ بھال کی۔ میں ان مہربان بوڑھے میاں بیوی کو بھی نہیں بھولوں گی۔ میں نے دل میں کہا۔

اگلی مرتبہ ہم تینوں سہیلیاں انگلستان گئیں لندن میں دوسرے سیاحوں کے ساتھ بکنگھم پیلیس کے پھاٹک پر کھڑے ہو کر گارڈز کی تبدیلی کا نظارہ کیا۔ اور ٹاور میں جاکر کراؤن جویلز دیکھے میڈیم تسا کا عجائب خانہ اور جان اور بورن کا تازہ ڈرامہ ملاحظہ کیا اور خوش خوش پیرس آئیں۔

اوائل ۵۹ء میں مع اپنے ہم جماعت طلباء کے فرانس کے کسی صوبے میں ROMANESQUE طرز تعمیر کا مطالعہ کرنے گئی۔ ہوسٹل واپسی پر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی میز پر رکھے ایک دعوت نامے پر نظر پڑی جو ایرانی سفیر کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے فوراً چرخی سے لگی رسی کی گھنٹی تین دفعہ ہلائی جس کا مطلب تھا اشد ضروری۔ فوراً اوپر آؤ۔

مہری کمبوجیہ بھی وہی دعوت نامہ لئے اوپر پہنچیں۔ ہالینڈ پویلین کے پانچوں ایرانی طلباء کے نام وہ کارڈ آئے تھے جو بے حد عزت افزائی کی بات تھی۔ ہز امپیریل میجسٹی محمد رضا پہلوی اسٹیٹ وزٹ پر فرانس آئے ہوئے تھے اور فلاں تاریخ کو اپنے سفارت خانے میں ایرانی طلباء سے

ملنا چاہتے تھے۔

ایرانی سفارتخانے کی دعوت بہت ہی خیرہ کن عالی شان منظر تھا۔ فرانس کے اہم ترین لوگ اور ان کی بیویاں ہیرے اور منک گاؤن۔ وردیاں۔ ہال کے ایک سرے پر آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ آتش دان کے اوپر شاہ کے برابر جہاں ملکہ ثریا کی تصویر لگی رہتی تھی اب وہ جگہ خالی تھی۔ اس خالی جگہ کو دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔

کچھ دیر بعد ہز امپریل میجسٹی کی آمد کا اناؤنسمنٹ کیا گیا۔ مجمع میں مؤدب سکوت طاری ہو گیا۔ سب دیواروں کے برابر برابر کھڑے ہو گئے۔ اعلیٰ حضرت اندر داخل ہوئے۔ اپنی تیز گہری نظروں سے چاروں طرف نگاہ کی۔ اور شاہانہ تبسم سے مسکرائے۔ بہت سنجیدہ متین انسان تھے اور بہت دلکش۔

پہلے وی۔ آئی۔ پی لوگ ان سے ملوائے گئے۔ ان میں سے چند سے اعلیٰ حضرت نے مختصر گفتگو کی۔ اس کے بعد طلبا۔ پیش کئے گئے۔

اپنی باری پر میں آگے بڑھ کر گھٹنوں سے ذرا سا جھکی۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ بادشاہ کے سامنے کتنا جھکنا چاہیئے۔ کیونکہ جس وقت ایرانی اور یوروپین خواتین CURTSEY کر رہی تھیں میں نے ان کو نہیں دیکھا تھا اپنی دوستوں سے باتوں میں مشغول تھی۔

لیکن مجھے معلوم تھا کہ رائلٹی پہلے بات کرتی ہے۔ شاہ نے پوچھا:

"پیرس میں کیا پڑھ رہی ہو؟"

میں نے بتایا۔
"یہاں رہنا اچھا لگتا ہے؟"
"جی ہاں یور میجسٹی۔"
"گریجویشن کے بعد کیا ارادہ ہے؟"
"اپنے وطن واپس جاکر لوگوں کے لئے مکان بناؤں گی یور میجسٹی۔"
شہنشاہ مسکرائے۔ لگتا تھا ان کو یہ جواب پسند آیا۔
دوسری طالب علم پیش کی گئی۔ میں نے پھر کرٹسی کی اور پیچھے ہٹ گئی۔

چند ماہ بعد ۱۹۵۹ء کے موسم گرما میں فرح، مہری اور لزا چھٹیاں گذارنے وطن واپس گئیں۔ تہران تیزی سے بدل رہا تھا۔ نئی عمارتیں، نئی سڑکیں، حال ہی میں ایران ڈاکٹر مصدق والے المناک سیاسی کرائسس سے گذر چکا تھا۔

چھٹیاں ختم ہونے سے ذرا قبل مجھے یاد آیا کہ پیرس کی تعلیم کے سلسلے میں وزارتِ تعلیم میں کچھ کام اٹکا ہوا ہے۔ میں نے اپنے چچا سے اس کا ذکر کیا۔ یہ وہی چچا تھے جو مجھے نوروز پر بادشاہ سلامت کی عطا کردہ پہلوی اشرفیاں دیا کرتے تھے اور جواب بھی اعلیٰ حضرت کے چیمبرلین تھے۔ یہ چچا ہزامپیریل میجسٹی کے داماد اردشیر زاہدی کے بھی دوست تھے۔ اردشیر زاہدی شاہ محمد رضا پہلوی کی اکلوتی لڑکی شاہ دخت شہناز کے شوہر تھے اور وزارتِ تعلیم میں اس شعبے کے سربراہ تھے جو بیرونی ممالک میں پڑھنے والے طلباء کے معاملات سے تعلق رکھتا تھا۔

پچچا نے کہا کہ میں آقائے اردشیر زاہدی سے اپوائنٹمنٹ کروائے دیتا ہوں تم جاکر دفتر میں ان سے مل لو۔

چنانچہ ایک سہانی صبح میں وزارتِ تعلیم پہنچی اور ہال میں بیٹھی ریسپشنسٹ لڑکی سے کہا کہ ان کو اردشیر زاہدی صاحب سے وقت ملاقات مقرر کیا جا چکا ہے۔ لڑکی نے مجھے فوراً اندر پہنچا دیا۔

اردشیر زاہدی اپنی میز پر ایک فائل میں مستغرق تھے۔ ایک نوجوان خاتون کو اندر آتا دیکھ کر تعظیماً اٹھے اور مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ چار منگوائی میں نے پیرس میں اپنی مزید تعلیم سے متعلقہ مسئلے کا تذکرہ کیا۔ آقائے زاہدی نے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد ان کی فائل منگوا کر دیکھیں گے۔ اس کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

اچانک انہوں نے کہا " خانم آپ پیرس واپس جانے سے قبل کسی روز ہمارے ہاں آکر کھانا کھایئے۔ شاہ دخت آپ سے مل کر بہت ہوں گی۔

میں نے جواب دیا کہ کسی روز ضرور ان کے ہاں آؤں گی۔ آقائے زاہدی دروازے تک پہنچانے آئے۔ میں ان فائلوں اور پیرس کے کالج میں اپنے نئے کورس کے متعلق سوچتی ہوئی گھر واپس لوٹی۔

اگلے ہفتے ایک ڈنر میں شاہ دخت شہناز سے میری اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے پہلی ملاقات ہی میں مجھے پسند کیا۔ آئندہ چند دنوں میں پھر مختلف پارٹیوں اور دعوتوں میں ہم ایک دوسرے سے ملے۔ ایک

ہفتے بعد میرے نام شاہ دخت کا دعوت نامہ پہنچا۔ انہوں نے اپنے محل واقع شمران طعام شب کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس ڈنر کے بعد شاہ دخت نے فرح خانم کو دوبارہ اپنے ہاں کھانے پر بلایا۔

وہ ایک گرم روشن سہ پہر تھی۔ میں پیرس واپس جانے کیلئے اسباب باندھنے میں مصروف تھی اور متفکر تھی کہ وزارت تعلیم سے ان کے مسئلے کے متعلق اب تک کوئی سرکاری جواب موصول نہیں ہوا۔ شام ہونیوالی تھی، میں اپنے سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہی تھی کہ ان کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی چچی اندر آئیں۔

"میرے لیے منسٹری سے کوئی خط آیا۔" میں نے پر امید لہجے میں دریافت کیا۔

"خط۔؟ نہیں تو۔ میں تو تمہیں یہ یاد دلانے آئی ہوں کہ آج شام کو تمہیں شاہ دخت کے محل جانا ہے۔ تم سفر کی تیاری میں اتنی مصروف ہو کہ مجھے خیال آیا کہ تم وہاں جانا بھول نہ جاؤ۔"

"نہیں۔ میں نہیں بھولوں گی لیکن چچی مجھے بڑی فکر ہے۔ آپ چچا سے کہیے کہ کل صبح آقائے زاہدی کو میرے فائل کے متعلق ضرور بضرور فون کر دیں۔"

"ہاں ہاں کہہ دوں گی لیکن تم آج شام ہی آقائے زاہدی سے ان کے محل میں ملنے والی ہو۔"

اتنا کہہ کر چچی کمرہ سے غائب۔

اندھیرا پڑے شمران جاتے ہوئے فرح خانم نے دیکھا۔ شاہراہ پہلوی کے دونوں جانب استادہ اونچے پوپلر اپنی پتیاں گرانے لگے تھے۔ موسم خزاں کی خنک اور فرحت بخش ہوا چلنی شروع ہوئی تھی۔ آفتاب کوہ البرز کے پیچھے غروب ہونے والا تھا۔ جب فرح خانم کی کار شاہ دخت شہناز کے قصر میں داخل ہوئی، باغ پر ارغوانی روشنی پھیل رہی تھی جو بہت جلد شام کے سرمئی دھندلکے میں تبدیل ہوگئی۔

شاہ دخت لاؤنج میں اپنی مہمان کی منتظر تھیں وہ ماد موزیل فرح دیبا کو اپنے عالیشان ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔

فرح خانم نے ہر رائل ہائی نس سے کہا کہ "ابھی تک منسٹری آف ایجوکیشن سے ان کے خط کا جواب نہیں آیا ہے۔

یہ تاخیر غالباً سرخ فیتے کی وجہ سے ہے۔ "ریڈ ٹیپ"

شاہ دخت نے مسکرا کر جواب دیا "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں صوفے پر بیٹھی شاہ دخت سے باتیں کر رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ہز امپیریل میجسٹی ڈرائنگ روم کے صدر دروازے میں کھڑے ہیں۔ مجھے ذرا تعجب ہوا۔ غالباً اعلیٰ حضرت اتفاقیہ اپنی بیٹی سے ملنے آگئے تھے۔ مجھے علم نہ تھا کہ شاہ بھی اس مختصر نجی دعوت میں شرکت کرنے والے ہیں۔

جب شہنشاہ اپنے شاہانہ وقار سے چلتے کمرے میں داخل ہوتے ہم دونوں فوراً تعظیماً کھڑی ہوگئیں۔ شاہ دخت نے اپنے والد سے میرا تعارف کرایا۔

" ہز میجسٹی نے مسکرا کر کہا کہ ان کو مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن مجھ پر انہوں نے جس انداز سے نظر ڈالی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکے حالانکہ صرف چند ماہ قبل میں پیرس کے ایرانی سفارت خانے کی دعوت میں ان کے حضور میں بطور طالبعلم پیش کی گئی تھی۔

اس کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے میں بالکل نروس نہیں تھی ۔ اعلیٰ حضرت نے دیکھا کہ صرف ۲۱ برس کی عمر اور میں اپنی گفتگو بڑی خود اعتمادی سے کر رہی تھی اور خیالات سے ذہنی پختگی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ میں شاہ کو امپریس کرنے کی کوشش نہیں کر رہی نہ ضرورت سے زیادہ سمارٹ اور ذہین بننے کی سعی میں مصروف ہوں۔

شہنشاہ دنیا دیکھے ہوئے تھے اور انسانوں کو پرکھ سکتے تھے۔ زیادہ تر لوگ جو ان سے ملتے تھے ان کو بے انتہا مودب رہنا پڑتا تھا یا وہ حد سے زیادہ مرعوب ہو جاتے تھے۔ کوئی شخص شہنشاہ ایران کے ساتھ بے تکلفی کا رویّہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر آپ رائنٹی سے دوستانہ حیثیت سے بھی ملیں تب بھی آپ کو ایٹی کیٹ اور پروٹوکول کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور ایک حدِ فاصل قائم رکھی جاتی ہے۔ ایک نوعمر لڑکی کے لئے جو اپنے بادشاہ سے پہلی مرتبہ سوشل طریقے سے مل رہی تھی۔ یہ وقت بہت کٹھن ہو سکتا تھا۔

شہنشاہ چالیس سال کی عمر میں یہ بھی جانتے تھے کہ ان کو بیوی کی حیثیت سے کس نوع کی عورت درکار ہے ۔

ہز امپیریل میجسٹی اپنی بیٹی کے گھر پہ طعام شب کے لئے بھی ٹھہر گئے۔ کھانے کی میز پر بھی وہ زیادہ تر مجھ سے باتیں کرتے رہے، شاہ دخت ہی نے چند روز قبل اعلیٰ حضرت سے کہا تھا کہ ان کی ایک، اعلیٰ شریف خاندان کی لڑکی سے ملاقات ہوئی ہے اور فلاں شام میرے ہاں آکر ان سے مل لیجیے۔ اور اب یہ ملاقات کامیاب معلوم ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہوتے اعلیٰ حضرت کو معلوم ہوا کہ مجھے اسپورٹس سے بے حد دلچسپی ہے۔ شاہ خود بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کسی روز ان کے محل آکر ان کے گھر والوں کے ساتھ ٹینس کھیلیں۔

موسم گرما کی تعطیلات عنقریب ختم ہوا چاہتی تھیں۔ مہری اور لزا واپس پیرس چلی گئیں۔ لیکن وہ بہت متعجب تھیں کہ میں ان کے ہمراہ فرانس کیوں نہیں گئی۔

ہالینڈ پویلین واپس پہنچ کر مہری اور لزا نے اپنی سہیلی کا انتظار شروع کیا۔ ہر روز وہ صبح صبح ایک تازہ گلدستہ خرید کر اسے فرح خانم کے کمرے کے گلدان میں سجا دیتیں اور متوقع رہتیں کہ آج کی فلائٹ سے فرح خانم طہران سے آجائیں گی۔

ایک صبح وہ گلدستہ خرید کر ہوسٹل واپس آرہی تھیں کہ راہ میں ان کو ہوسٹل کی بوڑھی کونسی ارژ (عمارت کی دیکھ بھال کرنے والی خادمہ) ملی۔ اس نے کہا میں تم دونوں کو روز بلا ناغہ اپنی سہیلی کے لئے پھول خریدتے

دیکھتی ہوں۔"

"ٹرم شروع ہو چکی ہے لیکن وہ اب تک نہیں آئیں۔" مہتری نے جواب دیا۔

"آوہ۔" بڑھیا نے کندھے اچکاتے۔ "پھول مت خریدتی جاؤ، تمہاری سہیلی نے غالباً شاہ سے بیاہ کر لیا ہے اب وہ یہاں نہیں آئیگی۔"

دوسرے روز فرانس کے اخباروں نے جلی سرخیاں شائع کیں "شاہ ایران پیرس میں زیر تعلیم ایک ایرانی دوشیزہ سے شادی کرنے والے ہیں۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بوڑھی خادمہ علم غیب جانتی تھی۔

ہر رائل ہائی نس شاہ دخت شہناز کے محل میں ڈنر کے چند روز بعد مجھ کو اعلیٰ حضرت اور ان کے احباب کے ساتھ شام گذارنے کے لئے مدعو کیا گیا ٹینس کھیلتے میں ایک مرتبہ جب گیند بہت دور جا گری۔ فرح خانم نے اس کا انتظار نہ کیا کہ شاہی خادم اسے اٹھا کر لائے۔ دوڑتی ہوئی جا کر جھاڑیوں میں سے خود تلاش کر لائیں۔ ہز میجسٹی نے یہ نوٹس لیا۔

چائے کے وقت اعلیٰ حضرت نے چند اہم معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فرح خانم نے بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے اختلافات کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے یہ بھی نوٹس لیا۔ اور میں ان سے اتنی چھوٹی تھی کہ جب ان کی پہلی شادی مصر کی شہزادی فوزیہ سے ہوئی اس سال میں پیدا ہوئی تھی۔

۱۰۔ رضا شاہ کبیر اور سلطانہ تاج الملوک

دو دن بعد مس دیبا کو ہز میجسٹی تاج الملوک بادرشاہ نے اپنے قصر میں مدعو کیا۔ رضا شاہ کبیر کی بیوہ اگلے وقتوں کی ایک پُر جلال سلطانہ معلوم ہوتی تھیں حالانکہ ملکہ بننے سے قبل وہ بھی ایک مڈل کلاس خاتون تھیں۔ شاہ محمد رضا پہلوی اپنی ماں کو بے حد چاہتے تھے۔ نادر شاہ کا قصر ان کی اولاد کے لئے اب بھی ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

رائل فیملی دراصل پشتینی خاندان نہیں تھا (گو ابھی چند سال قبل شاہ محمد رضا پہلوی کا سلسلۂ نسب سائرس سے ملا دیا گیا ہے) رضا شاہ پہلوی ایک عام آدمی تھے جو شمالی صوبہ مازندران کے ایک سخت کوش سپاہی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے وہ چھ ہفتے کے تھے جب ان کے باپ چل بسے۔ ان کی والدہ ان کو رشتہ داروں کے پاس لے جانے کیلئے طویل خطرناک سفر پر روانہ ہوئیں۔ برف پوش کوہستان البرز کی پیچیدہ راہوں میں پہنچ کر ان کا کارواں بھٹک گیا۔ شدید برف باری کی وجہ سے راستے مسدود تھے نوزائیدہ رضا خاں کی والدہ گود میں بچے کو سنبھالے گھوڑے پر سوار تھیں۔ بچہ سردی کی وجہ سے نیلا پڑ چکا تھا۔ انھوں نے دہشت زدہ ہو کر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اچانک انہیں چٹان کے پیچھے ایک چھوٹا سا مقبرہ دکھائی دے گیا۔ انہوں نے گھوڑا مقبرے کی طرف دوڑایا جس میں چراغ روشن تھا۔ کارواں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ مقبرے کے برابر

ایک چارخانہ بھی تھا۔ جس کے اندر سموری فرغلوں میں ملفوف چند پہاڑی سماوار کے گرد بیٹھے صبر سے برفباری کے تھاتے کے منتظر تھے۔ آگ جل رہی تھی۔ وہ ایک امام زادے کا روضہ تھا۔ رضاخاں کی والدہ نے قریب المرگ بچے کو مزار کے سامنے رکھ کر اس کی زندگی کی دعا مانگی۔

چارخانے کی گرمی یا امام زادے کے معجزے سے بچہ بچ گیا۔ اگر شمالی ایران کے پہاڑوں کی اس یخ لبستہ رات وہ بچہ سردی سے ہلاک ہو گیا ہوتا تو تاریخ ایران آج مختلف ہوتی۔

رضاخاں کا بچپن ایران کے سیاسی تنزل و انتشار کا زمانہ تھا۔ چودہ سال کی عمر میں رضاخاں نے اپنے خاندان کی روایت کے مطابق شہسوار رسالے میں معمولی زیر تربیت سپاہی بھرتی ہو گئے۔ وہ قطعی ان پڑھ تھے۔ حرف شناسی بھی نہ جانتے تھے۔ اس زمانے میں تعلیم صرف دولت مند طبقے کے بچوں کے لئے مخصوص تھی۔ جب اپنی ذہانت و صلاحیت کی بناء پر رضاخاں سپاہی سے ترقی کر کے افسر بن گئے۔ وہ دن میں روسیوں کے خلاف میدان جنگ میں جاکر مورچہ سنبھالتے اور رات کو اپنی بارک کے کمرے میں آکر لالٹین کی روشنی میں خود اپنی کوشش سے فارسی پڑھنا لکھنا سیکھتے۔

اس کی خانم ایک فوجی افسر کی سمجھ دار بیوی تھیں۔ جب وہ طہران کے ایک اپر مڈل کلاس محلے کے ایک مکان میں رہتے تھے جہاں ان کے توام بچے محمد رضا اور اشرف خانم پیدا ہوئے۔ اس وقت شاہ قاچار مع اپنے شاہی خاندان کے اپنے مرمریں محلات میں قیام پذیر تھے اور نہ جانتے تھے

تھے کہ چند برسوں میں تختہ الٹنے والا ہے۔

اسی وجہ سے مادر رضا شاہ خدا کی کارسازیوں کی بے انتہا قائل تھیں (ان دنوں یعنی ۷۹ء میں وہ مع دوسرے شاہی افراد کے ایران سے فرار ہو کر کیلی فورنیا میں تشریف رکھتی ہیں۔)

رضا شاہ کبیر کو معلوم تھا کہ خاندان ساسانیہ کا بانی بھی ایک معمولی سپاہی کا بیٹا تھا۔ سلاطین عثمانیہ کا جدِ امجد ایک سپاہی شاہانِ صفویہ کا مورثِ اعلیٰ مازندران کا ایک بے مایہ درویش تھا۔ رضا شاہ کبیر کو اس امر پہ فخر تھا کہ وہ سپاہی آدمی ہیں۔ انہوں نے اپنی والدہ کو سپاہیانہ تعلیم دلوائی۔ ملک کے نوجوانوں کی تندرستی (یہ ایک قدیم زرتشتی اصول بھی ہے) کا پروگرام شروع کیا۔ ان کے سارے لڑکے لڑکیاں ماہر شہسوار، نشانہ باز، چوگان کھیلنے اور طیارے اڑانے میں ایکسپرٹ ثابت ہوئے۔ شہزادیوں نے زنانِ نو کی رہبری شروع کی۔ ریڈ کراس کے طور پر "شیر و خورشید" کا ادارہ قائم کیا۔ شاہ کی سب سے چھوٹی بہن شاہ دخت فاطمہ ایک ماہر ہوا باز ہیں۔

چنانچہ اس غیر معمولی قسم کے سلیف میڈ بادشاہ کی بیوی اور اولاد سے ملنے اس شام خانم فرح دیبا مادرِ شاہ کے قصر پہ پہنچیں۔ کاخ سٹریٹ پر آئی ہوئی اس تاحال گمنام لڑکی سے ملنے کے لئے وہ سب موجود تھے۔

مجھے سب سے پہلے مادرِ شاہ سے ملوایا گیا۔ اس کے بعد وہ شہزادوں ان کی بیویوں اور شہزادیوں اور ان کے خاوندوں سے متعارف ہوئی۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ شاہی خاندان مجھ میں اچانک اس قدر

دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ چند منٹ بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے پرکھا جارہا ہے۔ شاہی خاندان کے افراد دزدیدہ نگاہوں سے بغور دیکھ رہے تھے کہ میں کس طرح چلتی ہوں، کس طرح بات کرتی ہوں، انداز گفتگو کیسا ہے تب اچانک پہلی مرتبہ مجھے قدرے گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ اتنی ساری شاہی آنکھوں کا مرکز بننا خاصے پریشان کن حالات تھے مگر بہت جلد میں نے اپنی خفیف گھبراہٹ پر قابو پالیا۔

مادرِ شاہ نے مجھے بہت پسند کیا۔ ان کے سارے خاندان نے بھی۔ ایک قدامت پرست ایرانی خاتون کی حیثیت سے مادرِ شاہ کو یہ بات بھی اچھی لگی کہ میں خالص ایرانی تھی۔ ملکہ فوزیہ البانوی نژاد مصری تھیں اور ملکہ ثریا نصف جرمن۔

شہزادیوں کو میری ELEGANCE اور شائستگی بے حد پسند آئی۔ شہزادوں کو میری آؤٹ ڈور زندگی اور سپورٹس میں دلچسپی بھی معلوم ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خانم فرح دیبا ان کے برادر معظم شہنشاہ ہمایوں کو پسند آئی تھیں اور اعلیٰ حضرت لوگوں کو پرکھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ (اپنی رعایا کے اصل جذبات بھانپنے میں البتہ غلطی کر گئے)

ڈنر بہت دلچسپ تھا لیکن قدرے تکلف شامل ہو چکا تھا کیونکہ شاہی خاندان کو معلوم تھا کہ مہمان خصوصی غالباً بہت جلد ان کی ملکہ بننے والی ہیں۔

۱۱۔ شمران کی ایک سنہری شام

شاہ دخت شہناز کے ڈرائینگ روم میں پہلی ملاقات کے ٹھیک ایک ہفتے بعد اسی کمرے میں شاہ نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اکتوبر کا آخری ہفتہ تھا۔ شام کی خنکی میں سردی کی لہر شامل ہو چکی تھی۔ باہر باغ میں خزاں کی خشک ہواؤں میں پلین کے درختوں کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ سارا شمران خزاں کے زرد پتوں کی وجہ سے سنہرا ہو چکا تھا۔ کہرے کے لطیف مرغولے باہر مکانات اور باغوں پر تیرتے پھر رہے تھے۔ سیلون پر گہری خاموشی تھی۔ اعلیٰ حضرت دریچے کے نزدیک ایک لوئی چہار دم کرسی پر فروکش تھے۔ وہ کچھ دیر سے مجھے اپنے بارے میں بتلا رہے تھے۔ ان کے فرائض، تصورات، مشن، گذرے ہوئے کل، آنے والے کل، خدا اور رسولؐ اور علیؑ اور آئمہؑ پر شدید اعتقاد۔ بین الاقوامی سیاست میں ایران کا رول، ایران کے مسائل۔ یہ ایک زندگی سے بڑا انسان تھا جو زندگی سے وسیع تر معاملات کے متعلق باتیں کر رہا تھا اور اپنی اس زندگی میں شرکت کرنے کی دعوت دے رہا تھا اور اس شخص کو میں بحیثیت شہنشاہ بچپن سے اپنا آئیڈیل اور قومی ہیرو تصور کرتی آئی تھی اور اس شخص کی شریکِ حیات بننا ایک بہت ہی عظیم ذمہ داری تھی۔

"کیا تم میری ذمہ داریوں میں شامل ہونا پسند کرو گی؟" شاہ نے معاً دریافت کیا۔

میں نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔

"جی ہاں۔"

مع اپنی والدہ اور ایک ممانی میں فرانس اپنا جہیز خریدنے بھیجی گئی۔ میں ایران کی ہونے والی ملکہ کی حیثیت سے یورپ جا رہی تھی۔ پروٹوکول کے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ لہذا مجھے ایک پرائیویٹ شہری کی طرح روانہ کیا گیا۔ لیکن "فرح دیبا اسٹوری" فرانسیسی پریس میں پہلے ہی چھپ چکی تھی۔ لہذا جنیوا کے ایرپورٹ پر رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کا جم غفیر موجود تھا۔

پیرس پہنچنے سے قبل جرنلسٹوں نے ان کی سہیلیوں اور ساتھیوں کو کالج کیمپس پر ڈھونڈ کر ان کے پروفیسروں اور شناساؤں کو انٹرویو کیا مگر کوئی قابلِ ذکر بات کہیں سے معلوم نہ ہوئی۔ ایک نارمل قسم کی ایشیائی لڑکی جو سینکڑوں مشرقی طلباء کی طرح فرانس میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔ اور بس لیکن یہی معمولی پن "فرح دیبا اسٹوری" کے سحر کا راز تھا جیسے کوئی لڑکی آپ کے پڑوس میں رہتی ہو اور وہ اچانک ایک بادشاہ سے شادی کر لے۔

دوسرے روز سارا پریس اورلی ایرپورٹ پہنچا۔ فرح خانم کی سہیلیاں بھی موجود تھیں۔ جب فرح خانم طیارے سے اپنی سہیلیوں کی طرف بڑھیں ایک لمحے کے لئے ان لڑکیوں نے تذبذب کا سامنا کیا۔ ہونے والی ملکہ سے کس طرح بات کی جاتے؟ کیا اسے YOUR FUTURE MAJESTY کہہ کر مخاطب کیا جاتے؟ ایک فرنچ لڑکی نے سوچا۔ کیا اب مجھے فرح کے سامنے CURTSEY کرنا چاہیئے؟

سفیرِ ایران برائے فرانس فرح خانم اور ان کی ماں اور مامی وغیرہ کو ایسکورٹ کر رہے تھے۔ فرح خانم اپنی سہیلیوں کو دیکھ کر بسرعت ان کے پاس پہنچیں۔ اور آہستہ سے کہا "میں وہی ہوں بدلی نہیں۔"

فرح خانم اور ان کی پارٹی کو پریس کی یلغار سے بچانے کے لئے ایک چور دروازے کے راستے باہر لے جایا گیا۔ اور ان کے ہوٹل کا نام بھی صیغہ راز میں رہا مگر پریس والوں نے اسے سونگھ نکالا۔ ایک رپورٹر ہوٹل کے ویٹر کا بھیس بدل کر عین اس سوئیٹ میں جا پہنچا جہاں ایران کی ہونے والی امپراطریس قیام پذیر تھیں۔ سارا فرانس بے حد اکسائیٹڈ تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اہلِ فرانس اہلِ ایران سے ایک نوع کی تہذیبی و نفسیاتی مناسبت و یگانگت رکھتے ہیں اور بالخصوص اس لئے کہ پیرس کی ایک طالب علم یعنی گویا ایک "ہوم ٹاؤن گرل" نے یہ کامیابی حاصل کی تھی۔

میری ایران واپسی پر منگنی کی اطلاع باقاعدہ اناؤنس کی گئی۔ مغربی عوامی پریس شاہ کے متعلق حسبِ معمول فنٹاسٹک خبریں چھاپتا رہا۔ مثلاً یہ کہ شاہ ایک شوقین اور ماہر ہواباز ہیں۔ فرح دیبا کو اپنے طیارے میں بٹھا کر سطح سمندر سے تیس ہزار فیٹ کی بلندی پر لے گئے اور وہاں کہا "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں" جب لڑکی نے ہاں کہا انہوں نے خوشی کے مارے طیارے کو چند قلابازیاں کھلائیں اور زمین پر واپس اترے۔

دوسری مقبول کہانی اس نسبت کے بارے میں "سنڈریلا اسٹوری" تھی کس طرح ایک مفلوک الحال اور غریب گھرانے کی لڑکی جو پیرس میں

برتن دھوکر کالج کی فیس ادا کرتی تھی اور محنت مزدوری کر کے کچھ پیسہ اپنے کنبے کی گذر اوقات کے لیئے ایران بھی بھیجتی تھی معاً پرنس چارمنگ کی اس پر نظر پڑی اور کدو کی بنی ہوئی گاڑی بلوریں کوچ میں تبدیل ہوگئی جس میں سفید گھوڑے جتے تھے۔

سنڈریلا کا جہیز کئی لاکھ پونڈ کی مالیت کا خریدا گیا۔

میں نے ایمپریس فرح پہلوی سے دریافت کیا "آپ نے شادی کے فوراً بعد خود کو ایک ملکہ کے رول میں کس طرح ڈھالا ؟"

کہنے لگیں کہ مجھے خیال نہیں آیا کہ آج سے میں ملکہ بن گئی ہوں تو میری ایک دم قلب ماہیت ہو جانی چاہیئے لیکن میں نے رفتہ رفتہ بہت جلد اپنے نئے ماحول سے مطابقت اختیار کر لی۔ دنیا کے قدیم ترین امپیریل دربار کے آداب نظروں میں رکھے۔ لوگوں کا اندازِ رفتار و گفتار۔ ایک ملکہ کو کس طرح وقار سے چلنا چاہیئے۔ تیز تیز قدم نہیں اٹھانے چاہئیں۔ کس طرح مسکرانا چاہیئے کس طرح نہیں۔ کس طرح مجمع عام میں لوگوں کے خیر مقدم کے جواب میں ہاتھ ہلانا چاہیئے۔ کس طرح ملاقاتی سے مصافحہ کرنے کے لئے خود پہلے ہاتھ بڑھانا چاہیئے۔ اور ہمیشہ مکمل سکون، وقار اور متانت کی تصویر بنا رہنا چاہیئے۔

لیکن ایرانی زندگی بنیادی طور پر اتنی مہذب اور پُر تکلف ہے کہ مجھے یہ سب عادات و آداب اختیار کرنے میں مطلق دقت نہ ہوئی۔

" ایک بات بتایئے۔ جب ساری دنیا کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی

تھیں بالخصوص آپ کا اپنا ملک ولی عہد کی ولادت کا متوقع تھا اور دنیا کے پریس نے آپ کے ہاں ولی عہد کی پیدائش کو ایک قسم کا عالمی مسئلہ بنا دیا تھا اس وقت آپ کو کبھی یہ پریشانی نہیں ہوئی کہ بفرض محال خدانخواستہ آپ کے ہاں بھی لڑکا تولد نہ ہوا تو ....." میں نے پوچھا۔

" بالکل نہیں۔ میں اس قدر مسرور اور پر اعتماد تھی، نوعمر اور صحت مند مجھے کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آیا کہ اس سلسلے میں مجھے کوئی مایوسی اٹھانی پڑے گی۔"

۱۹۶۰ء بہت اہم سال تھا۔ اس برس اعلیٰ حضرت نے انقلاب سپید کا آغاز کیا اور ہمارے ہاں ولی عہد ہمایوں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد میں خود اپنے آپ کو انقلاب سپید کی ایک سپاہی تصور کر کے تجدید و تعمیر نو کے کاموں میں منہمک ہو گئی۔ بہت جلد ایرانی عوام خصوصاً دیہات کے کسان ہم دونوں کو "آفتاب و مہتاب" اور "پدر و مادر" کہنے لگے۔

۱۲۔ تخت طاؤس

غالباً یہی شاہ کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی۔ دیہات میں شاید اب بھی پرانی وضع کی شاہ پرستی موجود ہو مگر شاہ نے یہ قطعی نظر انداز کیا کہ شہری مڈل کلاس اور انٹلی جنشیا اس میڈیول تصور کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکے گی۔ "ظلِ سبحانی" اور ایک کرم گستر بادشاہ جو اپنی وفادار رعایا کا خیال رکھتا ہو لیکن باغیوں کو بغیر ٹرائل شدید ترین سزائیں دیتا ہو سولہویں صدی

کے تصورات ہیں مگر آپ سوچیئے جب ہمارے منسٹر کرسی آسانی سے نہیں چھوڑنا چاہتے تو ایک مطلق العنان بادشاہ تخت طاؤس کیوں چھوڑنا چاہے گا۔

اور شاہ پر نکتہ چینی اور تنقید پر پابندی ایران میں مدتوں سے موجود ہے راقم الحروف کے ماموں سید غضنفر علی نقوی ۴۲ء سے ۴۷ء تک برطانوی ہند کے قونصل خانے واقع طہران میں شارڈی آفیسر تھے۔ انہوں نے واپس آ کر اس وقت بتایا تھا کہ شاہ کے خلاف کوئی شخص ایک لفظ نہیں کہہ سکتا نہ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں نہ سرکاری معاملات کے سلسلے میں۔

قصہ مختصر یہ کہ "آفتاب و مہتاب" اور مادر و پدر کا جشن تاجگذاری انتہائی تزک و احتشام سے منایا گیا جس کا تذکرہ آپ کوہ دماوند حصہ اوّل میں پڑھ چکے ہیں اور اکتوبر ۶۷ء میں شہبانوئے ایران کاخِ گلستان میں شہنشاہ ایران کے سامنے دو زانو جھکیں اور اعلےٰ حضرت نے ان پر افسر شاہی رکھا۔

پیرس کے ایرانی سفارت خانے میں طالب علم فرح خانم کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہز میجسٹی کے سامنے کس انداز سے جھک کر کرنسی کرنی چاہیئے۔ ان کو اس وقت یہ بھی معلوم نہ تھا کہ صرف چند سال بعد کاخِ گلستان کے دربار ہال میں تخت طاؤس پر بیٹھے ہوئے اعلیٰ حضرت ان کے سر پر ہیروں سے جگمگاتا تاج رکھیں گے اور جب فرنچ جشن FEASTO & KINGS میں فرح دیبا نے کاغذ اور پنّی سے بنا نقلی تاج پہنا تھا تب بھی۔ اور اکتوبر ۶۷ء میں ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ صرف آٹھ سال بعد اس تخت وطاؤس کے لالے پڑ جائیں گے۔

"آپ نے کبھی ان جلا وطن طلبار کا سامنا کیا جو مغرب میں مقیم اور شہنشاہیت کے خلاف ہیں ؟" میں نے ایک روز سوال کیا۔ کہنے لگیں ،" جب ہم پچھلی مرتبہ مغربی جرمنی اسٹیٹ وزٹ پر گئے تھے تو ایرانی طلبا نے ہم دونوں کے خلاف خوفناک نعرے بلند کئے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا وطن کتنی ترقی کر رہا ہے اور جن اصلاحات کے وہ خواہاں ہیں نافذ کی جا چکی ہیں۔ رہا میرا تاج تو اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک روایت کا سمبل ہے اور پہننے میں بہت وزنی ہے۔ میں پبلک میں منی اسکرٹ نہیں پہنتی اور نوجوانوں کے مجمع میں سگریٹ نہیں پیتی کہ میری نقل میں وہ بھی تمباکو نوشی شروع کر دیں گے۔

"آپ نے کبھی ایرانی خواتین کے لئے اس مغربی لباس کی بجائے ایک قومی لباس کے متعلق سوچا ہے ؟" میں نے دریافت کیا۔

" بہت سوچا لیکن تمہاری ساڑی موجودہ دور میں بھی پہنی جا سکتی ہے ہماری روایتی پوشاکیں اس قدر بھاری اور متنوع ہیں کہ ان کو دورِ حاضرہ میں پہن کر روزمرہ کے کام انجام نہیں دیئے جا سکتے مگر میں نے ان قومی پوشاکوں کے بہت سے موتیف لے کر نئے ڈریس ڈیزائن کئے ہیں اور روایتی موتیف کی ہینڈلوم کپڑوں کو فروغ دینے کی کوشش میں مصروف ہوں۔"

"قومی رقص ؟" میں نے پوچھا۔

" ہمارے قومی رقص روس کے لوک ناچوں سے اس قدر مشابہ ہیں کہ اگر ہم ان کو فروغ دیں تو بالکل معلوم ہوگا کہ روسی لوگ ناچ رہے ہیں۔ پھر

بھی ان کی ترویج کی جارہی ہے اور قومی موسیقی کی بھی ۔"

"آپ کی تعریف و توصیف میں ایرانی پریس میں اتنے مضامین چھپتے ہیں ان کو پڑھ کر آپ کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

" اگر آپ ایک انسان کو ایک سو تمغے عنایت کر دیں تو اس شخص کے دل میں ان تمغوں کی کوئی وقعت نہیں رہے گی۔ مجھے قصیدہ خوانی پسند نہیں اور میں اپنی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ اگر میں نے اپنی قوم کے لئے کچھ نہ کیا ہوتا تب میری اس طرح قصیدہ خوانی کی جاتی کیونکہ میں ملکہ ہوں اور مبالغہ آمیز ثنا خوانی مشرق کی روایت ہے ۔"

۱۳۔ ایرانِ نو کی نئی خواتین

ایران میں عورتوں کی تحریکِ آزادی ستر اسی سال پرانی ہے اور سوا سو سال قبل طاہرہ زریں تاج کو ملاؤں نے شہید کیا تھا (گو طاہرہ کا بالکل تذکرہ نہیں کیا جاتا ۔)

ڈاکٹر مہر انگیز دولت شاہی ممبر پارلیمنٹ ، ہائیڈل برگ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کا مکان بولیوار ایکز تھ پر ہے جس روز میں ان سے ملنے گئی ۔ وہ ایک دن قبل کسی زنانہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کر کے یوروپ سے لوٹی تھیں۔
کیہان ، اطلاعات اور زنانہ رسالوں کے عالی شان دفاتر میں جو پرانے فائل میں نے دیکھے تھے ، ان سے اندازہ ہوا کہ ایرانی عورتوں کی یہ ترقی واقعی حیرت انگیز ہے۔ خود ہمارے ہاں ہندوستان میں اور ترکی ، مصر ، شام وغیرہ

میں عورتوں کی جدوجہد متوازی خطوط پر ہوتی ہے یعنی سب سے پہلے اوپری طبقہ کے چند روشن خیال بزرگوں نے اپنی لڑکیوں کو پردے کے اندر مغربی تعلیم دلوائی۔ اس سے قبل مشنریوں نے اسکول قائم کئے اور نئی تعلیم یافتہ خواتین کو ایک ہی قسم کا محاربہ قدامت پرست طبقے اور ملاؤں سے کرنا پڑا۔

امریکن مشنریوں نے طہران میں ۱۸۳۸ء میں لڑکیوں کے لئے سکول کھولا تھا اس میں زیادہ تر عیسائی لڑکیاں داخل ہوئیں کیونکہ ملاؤں نے فتوے دے دیا تھا کہ مغربی تعلیم حاصل کرنا شیطانی فعل تھا لیکن اواخر انیسویں صدی میں چند لبرل امرا نے اپنی لڑکیوں کو گھر پر فرانسیسی تعلیم دلوائی پھر ان لڑکیوں نے پرائیویٹ مدرسے قائم کئے۔ ۱۹۰۵ء کے دستوری حقوق کی جدوجہد کے زمانے میں نئے ادیبوں اور شاعروں نے تعلیم نسواں کے متعلق مضامین لکھنے شروع کئے۔ بالکل اسی زمانے میں ہمارے ہاں علیگڈھ میں مدرسۂ نسواں کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ متعدد ایرانی وطن پرستوں نے اسی دور کے "نوجوان ترکوں" کے مانند یورپ کی جلاوطنی میں وہاں سے ترقی پسند رسالے شائع کئے۔ ایران میں اس قسم کے مضامین لکھنے والوں کو جیل بھیج دیا گیا لیکن خود پردہ نشین عورتوں نے قومی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے نیشنل بنک قائم کرنے کی پروجیکٹ کی مدد کی۔ تبریز کی خواتین نے مظفر الدین شاہ قاچار کی رجعت پسند افواج کا مقابلہ کرنے میں اپنے مردوں کی اعانت کی۔ فوجی محاصرے کی وجہ سے قحط پڑ گیا۔ اس وقت زنان تبریز نے جنگلوں اور کھیتوں میں جا کر خودرو سبزیوں اور جڑی بوٹیوں سے اپنے بچوں کا پیٹ بھرا۔

اور لڑائی میں مردوں کی ہمت افزائی کی۔ انقلاب ۱۹۰۶ء کے دوران عورتیں اپنی چادروں میں پستول چھپا لیتی تھیں۔ بنک آف ایران کو تیس کروڑ تومان کی حاجت ہوئی، ایرانی عورتوں نے زیور فروخت کر ڈالے۔ ایک غریب دھوبن مجلس (پارلیمنٹ) صرف ایک تومان لے کر بنک کو چندہ دینے پہنچی تھی۔

۱۹۰۷ء میں خانم طوبائے آزمودہ (جو فرانسیسی تعلیم حاصل کر چکی تھیں) اور یوسف خان موید الملک نے طہران میں گرلز سکول قائم کئے۔ یوسف خان فرانسیسی نژاد تھے۔ ان کے والد کو ناصر الدین شاہ قاچار نے مدرسہ الفنون میں پڑھانے کے لئے پیرس سے بلوایا تھا۔ یہاں انھوں نے ایک ایرانی خانم سے شادی کی۔ یوسف خان ان کی اولاد تھے (ان کے قائم کردہ اسکول رازی میں جو ایران کے بہترین مدارس میں شمار کیا جاتا ہے، مادموزیل قرح دیبا نے پڑھا۔)

۱۹۰۸ء میں ایک ایرانی مسلمان لڑکی بغرض اعلیٰ تعلیم امریکہ گئی۔

۱۹۱۱ء میں ایرانی عورتوں نے عورتوں نے پارلیمنٹ کے سامنے روسی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف پرزور مظاہرے کئے۔ برقعہ پوش خانموں نے اس موقع پر بہارستان اسکوائر میں زوردار تقریریں کیں اور نظمیں پڑھیں۔ ان کی بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ ان جوشیلی مقرروں میں خود طہران کے چیف آف پولیس کی بیوی شامل تھیں۔ ملاؤں کے خوف سے خواتین ایک دوسرے کے گھروں پر جمع ہو کر جدوجہد حقوق کیلئے خفیہ میٹنگیں کرتی تھیں۔ روسی شکر کی امپورٹ کے خلاف انھوں نے مظاہرے کئے۔ طہران ٹراموے ایک بلجین کمپنی کی ملکیت تھی۔ اس بیرونی اجارہ داری کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا۔ وہ

ٹراموے کے مسافروں کو روک روک کر کہتیں "ہم سے گھوڑا گاڑی کا کرایہ لے لو مگر بس ٹرام کمپنی کو استعمال نہ کرو۔

خانم مستورہ افشاری ایک آذربائیجانی امیر کی بیٹی تھیں۔ وہ طفلس (جارجیا) اور استامبول میں رہ چکی تھیں اور روسی، فرینچ اور ترکی ماہر تھیں۔ انہوں نے ایک زنانہ انجمن قائم کی۔ ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ خانم صدیقہ اصفہانی علمائے اصفہان کے ایک خاندان کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے ۱۹۱۷ء میں لڑکیوں کا مدرسہ اصفہان میں قائم کیا اور ایک اخبار جاری کیا جسے وہ خود ایڈیٹ کرتی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے فرانس جاکر پڑھا۔ رضا شاہ کبیر نے ۱۹۳۷ء میں جو گرلز کالج قائم کیا اس میں نامور شاعرہ پروین اعتصامی نے پڑھایا۔ جوانمرگ پروین نے ۱۹۴۱ء میں انتقال کیا۔

رضا شاہ کبیر نے عورتوں کی دنیا ہی بدل دی۔ پردے کو ۷ جنوری ۱۹۳۶ء کے شاہی فرمان کے ذریعے قانوناً ختم کیا اور مغربی لباس پہننے کا حکم دیا۔ ۱۹۵۹ء میں شاہ دخت اشرف پہلوی نے خواتین کی انجمنوں کی کونسل قائم کی۔ شاہ ایران نے ۱۹۶۲ء میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق عطا کیا۔

ہندوستان کی دیہاتی مسلمان عورتوں کی طرح دیہی ایران کی عورتوں نے بھی کبھی پردہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر مہر انگیز دولت شاہی جو خواتین کی عالمی کونسل (ہیڈ کوارٹرس پیرس) کی نائب صدر ہیں، سے میں نے پوچھا "آپ لوگ فراک پہن کر نماز کس طرح پڑھتی ہیں؟" انہوں نے فوراً اپنی ایک عزیزہ کو بلایا جو فراک میں ملبوس تھی۔

وہ اپنی چادر اور جا نماز لے کر آئی۔ جا۔ نماز بچھا کر چادر اوڑھ کر اس نے مجھے بتایا کہ ایسے۔

قصہ مختصر جس طرح ہندوستان میں جدید قوم پرستی، مشنریوں کے اثر اور انگریزی حکومت کی وجہ سے عورتوں نے جدید تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اسی طرح ایران میں جدید قوم پرستی، مشنری اور فرانسیسی تہذیبی اثر سے تعلیم نسواں کا چرچا ہوا۔ ہندوستان ایک غلام کونیل ملک تھا۔ ایران اپنی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ میں کبھی غلام نہیں رہا۔ لہٰذا وہاں ایک مغربی حکومت کے تسلط کے اثر کے بجائے خود اپنی جدو جہد سے ترقی کی گئی۔ ایک بار مجھے شہبانو فرح پہلوی نے بتایا کہ جب وہ پیرس میں زیر تعلیم تھیں۔ وقتاً فوقتاً افریقی اور ایشیائی طلبا۔ کالج میں اپنے اپنے یوم آزادی کی تقریبات منعقد کرتے رہتے تھے۔ فرح خانم سے ایک مرتبہ ان کے فرینچ ساتھیوں نے پوچھا۔ تم ایرانی اپنا یوم آزادی کس مہینے میں مناتے ہو؟ میں نے کہا ہم کبھی غلام ہی نہیں رہے۔

۱۴۔ دفتر مخصوص علیا حضرت

طہران کے سرکاری دفاتر دولت اور ایرانی خوش ذوقی کی بدولت محلات کی طرح آراستہ ہیں۔ طویل و عریض بیش قیمت قالین، جھاڑ فانوس، فرانسیسی فرنیچر، ہز میجسٹی کے بیوروکے دفاتر بھی اسی وضع کے تھے۔ پہلوی فاؤنڈیشن اور سرکاری امداد سے چلنے والے یہ ادارے جن کے بجٹ کئی لاکھ ڈالر سالانہ ہیں، مغرب میں تربیت یافتہ ایرانی خواتین چلا رہی تھیں۔ ایک محل جس میں

پہلے ولی عہد رہتے تھے؛ فرح پہلوی سوسائٹی کا مرکزی دفتر تھا۔ اس کے باغ میں سیب سے لدے درخت استادہ تھے۔ کمرے تازہ پھولوں سے معطر و مفرح۔ یہ سوسائٹی سارے ایران میں پچاس یتیم خانے چلاتی تھی جس میں پندرہ طہران میں تھے اور یتیم خانے کی بجائے ہوسٹل کہلاتے تھے ماڈرن تصاویر اور قالینوں سے آراستہ ایک زنانہ یتیم خانہ ایک پارک میں بنی خوبصورت کاٹجوں پر مشتمل تھا۔ باغ میں لڑکیوں نے شمالی ایرانی گاؤں کی وضع کے گھر تعمیر کئے تھے۔ یتیم بچے تعطیلات میں کیسپین کے کنارے ہولی ڈے کیمپس میں بھیجے جاتے تھے۔ نیاوران میں یتیموں کا ہولی ڈے ہوم ایک بے حد شاندار موڈرن طرز تعمیر کی عمارت میں واقع تھا جو شہبانو نے خود ڈیزائن کی تھی۔ ڈائریکٹر کے دفتر میں میز پہ ایک نقرئی فریم میں دونوں طرف دو بزرگوں کی تصاویر۔ میں نے پوچھا۔ یہ کون ہیں فرمایا "رسول کریمؐ اور امام علیؑ"۔ ایران میں یہ تصاویر اس قدر دیکھ چکنے کے باوجود میں نے پھر تعجب سے پوچھا "آپ ان کی تصاویر کیوں بناتے ہیں؟"

انہوں نے میرے سوال پر حیرت کا اظہار کیا۔ پوچھا "کیا آپ مسلمان نہیں ہیں؟"

بچوں کے کتب خانے میں ہزار ہا کتابیں جدید ایرانی فن کاروں کی مصور کی ہوئی رکھی تھیں۔ شہبانو نے بھی ایک کتاب مصور کی تھی۔ وہ انہوں نے مجھے اپنے دستخط کر کے دی۔ وہ ہینس کرسچین اینڈرسن کی جل پری کا فارسی ترجمہ تھا۔ برفپوش کوہستانی علاقوں کے لئے گشتی کتب خانے قائم

کیے گئے۔ ورکنگ کلاس محلوں میں نرسری اسکول وغیرہ۔ اکثر فلاحی ادارے فرح پہلوی کی سہیلیاں چلا رہی تھیں۔ ان میں خانم لیلا امیر طہماسپ نے پیرس میں سوشل ورک کی تربیت حاصل کی تھی۔ ہما زرابی اور پروین خلعت باری ہارڈنگ کالجوں کی سربراہ تھیں۔ پیرس والی سہیلیاں مہری کمبوجیہ اور لرزاونیال ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد ایک یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں۔ ایک شام انہوں نے اپنی چند سہیلیوں کو مجھ سے ملوانے کے لئے کاخِ نیاوران میں بلوایا۔ جس وقت میں پہنچی، شہبانو وہاں موجود نہیں تھیں۔ ایک سہیلی نے مجھ سے کہا ابھی ابھی علیاحضرت کا فون آیا ہے، وہ معذرت خواہ ہیں کہ بروقت نہیں آسکیں۔ ولی عہد کی ایک تقریب میں خلافِ توقع ذرا دیر لگ گئی۔ ابھی آدھ گھنٹے میں آجائیں گی۔

ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ان کا ہیلی کاپٹر کاخ نیاوران کے باغ میں پہنچا۔ ہمارے ہاں سیاسی وی آئی پی تو خیر فلم اسٹار تک دو گھنٹہ لیٹ پہنچنا باعثِ فخر جانتے ہیں، معذرت خواہی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس وقت طہران کی ہزار ہا آفس گرلز، موڈلز، وٹیرسیں، استانیاں، پولیس افسر، فوجی لڑکیاں، جرنلسٹ، فن کار، بیلے ڈانسر، مصور، سیاست دان، ٹیلی ویژن والی لڑکیاں، اراکینِ پارلیمنٹ یہ تصور نہیں کر سکتیں کہ ان کی نانیاں دادیاں کیسی قید و بند میں زندگیاں گزار گئیں۔ شادی کے موقع پر دلہن مغربی سفید لباس اور باریک سفید ویل پہنتی ہے مگر روایتی ایرانی رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ قدیم و جدید کا سنگم ہر جگہ نظر آتا ہے۔ طہران کے زور خانوں میں (جن

کے پیٹرن کیبنٹ حضرت علیؑ ہیں) قدیم سیستانی پہلوانوں کے نام لیوا زورآور ڈنگل لڑتے ہیں۔ امجدیہ اسٹیڈیم میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے پہلے وہ قدیم دستور کے مطابق شاہی بالکنی کے سامنے سربسجود ہوئے اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے۔ ان کو دیکھ کر مجھے جاپانی پہلوان یاد آگئے اور کابوکی تھیٹر کے اداکار جو اسی طرح اپنے تماشائیوں کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔

شہبانو کا اپنا سکریٹریٹ تھا اور سارا کام باقاعدہ ایک وزارت کے پیمانے پر ہوتا تھا لیکن ان کو اپنے اس رول کے متعلق کوئی خوش فہمی اور خود فریبی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا ہزاروں ذاتی خط جو میرے نام آتے ہیں ان کے متعلق میرا رویہ حقیقت پسندانہ ہے۔ غربت اور دکھ نجی امداد یا خیرات کے ذریعے دور نہیں کئے جا سکتے۔ غربت اسی وقت ختم ہو گی جب سارے ملک کا معیار زندگی بلند ہو گا۔"

سڑک چلتے لوگ شہبانو کو روک کر ان سے مدد کی درخواست کرتے تھے۔ ایک روز ٹہلنے جا رہی تھیں ایک عورت نے راستہ روک کر کہا مالک مکان اسے نکال رہا ہے۔ ہز میجسٹی نے دوسرے روز اسے دوسرا مکان دلوا دیا۔ کار پر کہیں جا رہی تھیں۔ ایک بچے کو دیکھا جبڑے پر پٹی باندھے بھاری بالٹی اٹھائے جا رہا ہے۔ کار روک کر اس سے پوچھا۔ اس نے بتایا باپ بے کار ہے بہن بیمار اور خود مزدوری کر کے کنبے کا پیٹ پالتا ہے چونکہ اس کے باپ کے لئے فوری ملازمت تلاش نہ کی جا سکی۔ شہبانو نے اسے کاخِ نیاوران کے باغات میں جھاڑو دینے کے کام پر لگا دیا۔ لڑکے کو اسکول میں داخل کیا۔ بہن

کو ہسپتال بھیجا۔ وہی BENEVOLENT مخیر ملکہ کا رول۔

"وہ پہاڑی بڑھیا والا قصہ کیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

شہبانو نے ذرا جھینپ کر کہا "وہ دراصل قصہ یہ تھا کہ ہم لوگ دریائے ماژندران کے ساحل پر گئے ہوئے تھے۔ نوروز کی چھٹیاں تھیں۔ ایک سہ پہر میرے بچے شہسواری کے لئے نکلے اور دیر تک واپس نہ آئے تو میں نے گھبرا کر جیپ نکالی اور ان کی تلاش میں پہاڑ کی طرف چلی گئی۔ سکیورٹی افسر فوراً دوسری جیپ پر میرے پیچھے پیچھے آئے۔ میں ایک سنسان پہاڑی سڑک پر ڈرائیو کرتی جا رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا ایک دیہاتی عورت سر پر سکارف باندھے بھاری فل بوٹ پہنے وزنی بنڈل اٹھائے ہانپتی کانپتی چڑھائی طے کر رہی ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر لفٹ مانگی۔ میں نے گاڑی روک کر فوراً اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ اس دور افتادہ پہاڑی علاقے میں نہ ٹیلی وژن تھا نہ اخبار پہنچتا تھا۔ اس نے شاید میری تصویر بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہرحال وہ مجھے نہیں پہچان سکی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں واپس جا رہی ہے۔ اپنی لڑکی کے لئے کپڑا خریدنے قریب کے مارکیٹ ٹاؤن گئی تھی۔

"کیا تمہاری لڑکی کی شادی ہو رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں خانم! میری لڑکی سکول جاتی ہے۔ میں اس کے لئے گرل گائیڈ یونیفارم کا کپڑا خریدنے گئی تھی۔"

اس بات کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ یہ غریب پہاڑی عورت بھی اپنی لڑکی کو اسکول بھیج رہی تھی۔ وہ لڑکی گرل گائیڈ بن چکی تھی اور اس غریب

عورت نے پیسہ اس لئے بچایا تھا کہ اس کے لئے یونیفارم خرید سکے۔ ایران واقعی ترقی کر رہا ہے۔ پھر اس عورت نے مجھ سے پوچھا۔

"خانم آپ کون ہیں ؟"

"میں... میں علیا حضرت۔"

عورت نے آنکھیں جھپکائیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

میں نے کہا شہبانو۔ وہ تب بھی نہ سمجھی۔ یہ درباری القاب اس پس ماندہ کوہستان میں کسی نے نہیں سُنے تھے۔ وہاں کے لوگ ملکہ کو خاصے جمہوری انداز میں "زنِ شاہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا :

"زنِ شاہ ہستم۔"

"عورت ہکا بکا رہ گئی ہو گی ؟" میں نے شہبانو سے کہا :

اس کے بعد اس کی قسمت بدل گئی۔ اس کے شوہر کو طہران میں بہتر ملازمت دی گئی۔ لڑکی کو وظیفہ دے کر طہران بلایا گیا۔

"ہمارے ہاں ایک فارسی کہاوت ہے۔" شہبانو نے مجھ سے کہا : "نیکی کر اور دجلہ میں ڈال"۔ لیکن نیکی کے علاوہ عمومی آل راونڈ ترقی لازمی ہے اور میں امامِ علیؑ کے زریں اقوال ہمیشہ اپنے ڈیسک پر اپنے سامنے رکھتی ہوں"

سڑک پر خط دینے کے لئے لوگ جب میری طرف دوڑتے ہیں تو سادہ کپڑے سیکیورٹی افسروں کو ان کے ساتھ ساتھ بھاگنا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو مجھے پسند نہیں۔ میں ٹیلی ویژن پر لوگوں سے کہتی ہوں کہ میں آپ کے خط پڑھ کر جو کچھ ممکن ہے کر رہی ہوں لیکن یہ خطوط

خطوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شاہ کو بھی بہت خطوط ملتے ہیں۔
شہبانو کے نام خطوں کا یہ سلسلہ اس وقت سے جاری تھا جب ان کی شادی ہوئی تھی۔ پہلے مبارکباد کے خطوط ساری دنیا سے آتے پھر جب اطلاع ہوئی کہ ان کے ہاں ولادت ہونے والی ہے۔ بہت سے ایرانیوں نے ان کو تعویذ اور دعائیں لکھ کر بھیجیں کہ لڑکا پیدا ہو۔ فرانس سے ایک اجنبی خاتون نے اپنے خاندان کا ایک بیش قیمت ورثہ ایک سنہری جالی روانہ کی جس میں ان کے ہاں نسلاً بعد نسلاً نومولود بچے کا پنگوڑہ ڈھانپا جاتا تھا ایک اور اجنبی فرانسیسی نے فرانس سے ایک انتہائی مقدس مذہبی تحفہ جو کوئی بھی خوش عقیدہ رومن کیتھولک اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرے گا اٹھا کر فرح پہلوی کو اس دعا کے ساتھ ارسال کیا کہ وہ ایک فرزند کی ماں بنیں۔ یہ مقدس تحفہ ایک لبادے کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا جسے کسی زمانے میں ایک مشہور کیتھولک سینٹ نے پہنا تھا۔ مختلف ملکوں سے مختلف مذاہب کے لوگوں نے علم نجوم وغیرہ سے اخذ کی ہوئی خوشخبری روانہ کی کہ ان کے ہاں بیٹا ہی پیدا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں اتنے نرم دل اور مہربان لوگ اتنی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔" شہبانو نے مجھ سے کہا۔

شہریارِ وقت کی خدمت میں اپنے مسائل کے متعلق عرضیاں بھیجنا پرانی ایرانی رسم ہے لیکن فرح پہلوی کے نام خطوط کے بندوبست کے لئے ایک پورا محکمہ قائم ہے۔ اس کے ڈائریکٹر کے پاس سوربون پیرس کا ڈاکٹریٹ ہے۔ "ترقی پذیر ممالک میں عوام پر اخبارات کا اثر" ان کے مقالے کا موضوع

تھا جس پر ان کو ڈاکٹریٹ ملا۔ ان کے تحت ماہرین نفسیات اور سوشل ورکرز
کی ایک ٹیم کام کرتی ہے۔ جب میں یہ دفتر دیکھنے گئی اس میں ہر مہینے سات
ہزار خطوط موصول ہوتے تھے یعنی ہر تین منٹ کے بعد ایک خط۔
نوجوان کم مایہ لڑکیاں نئے جوتے یا نئے فراک کی فرمائش کرتی ہیں جس
طرح کا آپ اس روز فلاں تقریب میں پہن رہی تھیں۔ اس طرح کے جوتے
اور ڈریس بھیج دیئے جاتے ہیں۔ یہ اس قسم کی عنایات تھیں جیسے ہمارے
ہاں کے "غریب پرور" راجہ نواب اپنی رعایا کے ساتھ بعض اوقات اچھا
سلوک کرتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء ہی میں بغاوت کا ایک منظر میں نے دیکھا۔
طہران میں بچوں کی فلموں کا فیسٹول ہو رہا تھا۔ سینما ہال کے سامنے جم غفیر
جمع تھا۔ میں آقائے مسعود بازرین اور خانم مہین بازرین کے ساتھ نیچے بیٹھے
فلم دیکھ رہی تھی۔ شہبانو جیوری کے افراد اور بیرونی فلم ڈائریکٹرز کے ساتھ
بالکنی میں بیٹھی تھیں جب ہم لوگ پروگرام کے خاتمے پر باہر نکلے اور شہبانو اپنی
کار میں سوار ہوئیں یک لخت ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ چمڑے کے فراک میں
ملبوس ایک حسین ایرانی لڑکی نے شہبانو کی چلتی کار کے آگے آکر گرنے کی کوشش
کی۔ وہ ہسٹریائی آواز میں چلا رہی تھی۔ سیکیورٹی افسروں نے اسے سنبھالا اور
اس کا خط علیا حضرت کو پیش کیا۔ خط میں لکھا تھا کہ وہ خود اور اس کا شوہر بیروزگار
بیلے ڈانسر ہیں۔ لکھا تھا میں یہ خط آپ کو دوں گی اور اس کے بعد آپ کی
کار کے سامنے لیٹنے کی کوشش کر کے ہنگامہ کھڑا کروں گی تاکہ آپ میرے
کیس پر فوری توجہ دیں اور میرے شوہر کو ملازمت دلوائیں۔ مہربانی سے

میرے شوہر کی امداد کیجئے۔

بعد میں اس لڑکی نے پریس کو بیان دیا کہ ایسے موقع پر جب ہز امپریل میجسٹی وی آئی پی لوگوں، بیرونی فلم اسٹاروں اور ڈائریکٹروں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھیں ہیں ہسٹریکل شور و غوغا کر کے ہی ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکتی تھی۔

بیلے ڈانسر کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس ہنگامے کی وجہ سے وہ راتوں رات مشہور ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی کو ایک بیلے کمپنی میں کام بھی مل گیا۔

ہز میجسٹی کے بیورو میں کام کرنے والی ایک یہودی ایرانی بے حد حسین لڑکی ایک روز بڑے اصرار سے مجھے اپنے گھر لے گئی جو شہر کے ایک متمول محلے میں زمین دوز فلیٹ تھا۔ ہال میں حسبِ معمول میز پر پھول اور ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے لئے پستے بادام سے پُر قاب رکھے تھے۔ دیوار پر حضرت موسٰی کی بڑی تصویر، آتش دان پر اس لڑکی کے بھائی بھاوج کا رنگین فوٹو گراف جو اسرائیل میں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ لڑکی کی اماں صرف فارسی بولتی تھیں۔ کہا ہم لوگ یہاں شاہ فورس (یعنی سائرس) کے وقت سے آباد ہیں پھر حضرت موسٰی کا تذکرہ کرنے لگیں۔ تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولیں "مرد کامل بود"۔

وہ مرد کامل واقعی ایک عجیب وغریب امت اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ ایران کی قالینوں کی تجارت اور بہت سا کاروبار ایرانی یہودیوں کے

ہاتھ میں ہے۔

ایران اسرائیل کو تیل بھی سپلائی کر رہا تھا اور اس چیز کا تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا تھا اور آقائے مسعود یارزین اور ڈاکٹر کمال پاشا بہادری سے جب بھی میں نے کوئی سیاسی سوال کیا یا کوئی بھی سیاسی موضوع چھیڑا وہ نہایت خوبصورتی سے گفتگو کا موضوع بدل دیتے تھے۔

طہران سے باہر نئی آریہ مہر یونیورسٹی کے کیمپس پر تیز دھوپ میں جگمگاتے کارچوبی سیاہ گاؤن پہنے جواں سال خوش شکل خواتین اور مرد اساتذہ کی قطار۔ ملک کی نئی دولت کا اندازہ ان پروفیسروں اور لیکچراروں کے بڑھیا چوغوں ہی سے ہو رہا تھا۔ نئی نویلی یونیورسٹی نئے نویلے چوغے ہز میجسٹی کانوکیشن کے لئے آئے۔ بعد تقسیم اسناد نئے ڈینٹل کالج کے افتتاح کے لئے گئے یونیورسٹی کی طرح جس کا سارا ساز و سامان اعلےٰ اور جدید ترین تھا۔ ایک ترک جرنلسٹ لڑکی مع اپنے فوٹوگراف میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ تمہارے ہاں اتنی بڑی یونیورسٹی قائم ہوگئی ہے۔ اس نے متانت سے جواب دیا: "ہماری یونیورسٹی آف مڈل ایسٹ مشرق وسطیٰ کی سب سے بڑی درس گاہ ہے جس میں ایک لاکھ طالب علم پڑھتے ہیں۔"

آریہ مہر کے کیمپس میں ہر جگہ فارسی میں قطعات اور بورڈ لگے تھے۔ ترک لڑکی کہنے لگی میں جب بھی طہران آتی ہوں مجھے بڑا عجیب سا احساس ہوتا ہے، ایک لفظ نہیں پڑھ پاتی، جاہلوں کی طرح گھومتی ہوں۔

اتاترک نے لاطینی رسم الخط اختیار کر کے یوروپ سے حرفی رشتہ جوڑا

لیکن ترک بلحاظ حرف شناسی مشرق اوسط سے بالکل کٹ گئے۔

دوسری شام "نئے ہاؤس آف آرٹسٹس" جو اداکاروں اور پرفورمنگ فن کاروں کا محل نما کلب ہے، شہبانو تشریف لائیں۔ سارے مشہور فلمسٹار لوگ ایک قطار میں کھڑے ہوتے۔ اندر سیلوں میں نامور مغنیہ گوگوش نے پیانو پر ایک تہنیتی نغمہ سنایا۔ دھن مغربی، الفاظ فارسی۔ ترک لڑکی ایک ستون کے پیچھے کھڑی اپنے فوٹوگرافر سے تصویریں کھنچوا رہی تھی۔

ترکی کے خیال سے میں بہت مغموم ہوتی ہوں، بہت غریب ملک ہے، کاش وہاں بھی تیل نکل آتے۔ ترکی پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔ ایک چھوٹا سا نادار ملک۔ اللہ میاں وہاں بھی تیل نکال دیجیے نا پلیز۔

ترک لڑکی ہاؤس آف آرٹسٹس کا فارسی پروگرام دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگی "یہ کیا لکھا ہے؟" پھر اس نے کہا میں بہت دنوں سے علیا حضرت سے انٹرویو حاصل کرنے کی کوشش میں لگی ہوں لیکن معلوم ہوا ان دنوں وہ بہت مصروف ہیں۔

اگلی صبح وہ انقرہ واپس جا رہی تھی۔ جب میں ہلٹن پہنچی، کاؤنٹر پر تحفے کا پیکیٹ رکھا ملا۔ نفیس سبک ترکی زردوزی کے ہلکے سلیپر۔ اس لڑکی سے میں دوبارہ کہاں ملونگی؟ اس کا نام اور پتہ تک معلوم نہ تھا لیکن میرا ہمیشہ کا تجربہ ہے کہ شرقِ اوسط میں ترکوں سے زیادہ محبت شعار، نرم مزاج اور دل سے ملنے والی قوم اور کوئی نہیں ہے اسی قوم کو ساری دنیا ہمیشہ سے خونخوار اور خون ریز سمجھتی آئی ہے۔

راقم الحروف کی ایک رشتے دار صادقہ بیگم کئی برس سے طہران میں مقیم تھیں جہاں ان کے شوہر مصطفےٰ جعفری "ایران پاکستان، ٹرکی ریجنل ڈویلپمنٹ کارپوریشن" کے ایک اعلےٰ افسر تھے۔ صادقہ کے مکان کا پتہ بھی نہایت شاعرانہ تھا۔ کوچۂ آبشار، خیابانِ میکدہ، بولیوار الیزبتھ۔ افراطِ زر کی وجہ سے بے حد مہنگا مکان جدید ایرانی طرز کا تھا۔ سامنے ہال میں صرف ایک گول میز، اس پر گلدان میں تازہ پھول، پائیں باغ میں حوض، ڈرائنگ روم میں فرانسیسی فرنیچر۔

ایک شام میں صادقہ کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ وزارت اطلاعات و نشریات کے آقاے رشیدیاں مجھ سے ملنے وہیں آگئے۔ تسبیح ہزار دانہ پھیرتے رومی کا تذکرہ کرنے لگے۔ وہ رومی و حافظ کے معتقد نہیں تھے۔ کھانے کا وقت آگیا اٹھنے لگے۔ صادقہ نے کہا کھانا کھا کر جائیے، مان گئے۔

ان کے جانے کے بعد مصطفےٰ جعفری نے کہا، میں شرط لگاتا ہوں یہ ایرانی نہیں تھے آذری ترک تھے۔ ایرانی اس قدر تکلف کرتا ہے کہ اسے گڑھا کھود کر گاڑ دو مگر اسے پہلے سے مدعو نہیں کیا گیا ہے، وہ کسی کے ہاں اس طرح بے تکلفی سے کھانا کھانے کو راضی نہ ہوگا۔ صریحاً یہ صاحب ترک تھے۔

"گویا ایرانی یہاں کے لکھنوی ہیں اور ترک پنجابی۔" میں نے کہا۔

"کچھ یہی حساب ہے۔" مصطفےٰ جعفری بولے۔ "ارے صاحب یہاں اخلاق و تکلفات کا یہ عالم ہے کہ چور کو آقاے دُزد کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو قدر ہیرے جواہرات کی ہے اسی مالیت کے یہاں قالین ہیں لہذا قالینوں کا ایک سے ایک ماہر چور پڑا ہے۔ ایک بار اس محلے میں ایک

مکان پر چور ایک قالین دھونے کی فرضی کمپنی کا ٹرک لے کر آئے اور قالین لے کر چلتے بنے، پکڑے گئے۔ تھانے میں پولیس افسر نے پوچھا۔ آقائے دُزد آپ نے فلاں جگہ سے قالین چرانے کی زحمت کس روز گوارا فرمائی تھی؟"

"یہ گپ ہے!" میں نے کہا۔

"آپ کو یقین نہ آئے تو یہاں کچھ عرصہ رہ کر دیکھ لیجئے۔" صادقہ بولی۔

"میں نے یہاں کا طبقہ امراء بہت دیکھ لیا اب ذرا عوام کو دیکھنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ آپ کو یہاں امام زادوں کے مزاروں پر ملے گا۔" مصطفےٰ جعفری بولے۔

"یہاں بھی زندہ ہے ملّتِ بیضا غربا کے دم سے؟" میں نے پوچھا

۱۵۔ امام زادوں کی دنیا

روضہ شاہ عبدالعظیم جو غالباً برادر امام رضاؑ ہیں۔ ایران کے روضے قابلِ دید ہیں، سونے کے گنبد، اندر نہایت بیش قیمت سامان آرائش، متوسط الحال اور غریب لوگوں کا ہجوم روضہ شاہ عبدالعظیم کے نزدیک ایک جدید وضع کا عالیشان سنگلاخ مقبرہ رضا شاہ کبیر کا استادہ ہے جن کے جسد خاکی کو جوہینز برگ جنوبی افریقہ سے لا کر یہاں دوبارہ دفن کیا گیا تھا۔ مقبرہ اندر سے بالکل سادہ اور مرعوب کن ہے۔ اوپر ایک دیوار پر صرف ایک کاشانی قالین آویزاں ہے جس میں بُنے ہوتے ایک بزرگ ہاتھ میں قرآن شریف لئے آسمان کو دیکھ

رہے ہیں۔ معلوم ہوا رسول اللہ ہیں۔

طہران کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر قدیم شہر رَتے میں روضہ امام زادہ عبداللہؒ ایک سحر انگیز جگہ ہے۔ روضے کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے اور صادقہ کو پاکستانی زائرین سمجھ کر معلم نے انتہائی خوش الحانی سے زیارت پڑھوانی شروع کی۔ نقرئی ضریح کے اندر مرمریں مزار۔ انتہائی پرسکون راحت بخش جگہ قالین، جھاڑ فانوس، مرمریں ایوان۔ ایک ایوان میں ایک خانم کونے میں بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ روضہ امام زادہ عبداللہ پر بھیڑ نہیں ہوتی اور اپنے سکون اور طمانیت بخش خاموشی کیلئے مشہور ہے۔ باہر قبرستان میں سطح زمین کے برابر سنگھائے مزار پر مختلف صدیوں اور برسوں کی تاریخیں اور نام کندہ ہیں۔ ان ہی میں ایک قبر شہبانو کے والد کیپٹن سہراب دیبا کی ہے۔ اس نہایت بارونق اور بشاش سے گورستان میں چاروں طرف سرو کے درخت کھڑے ہیں۔ روضہ ایک گلی کے ذریعے شاہراہ سے ملحق ہے۔ چوڑی گلی میں دونوں طرف انڈر ٹیکرز اور کتبہ سازوں کی دوکانیں ہیں۔ چمکیلی شو ونڈوز کے اندر اونچے سنگی گلدان اور گلدستے، بوڑھی عورتیں موم بتیاں اور اگر بتیاں بیچ رہی ہیں اور آگے جاکر لوگوں کے خاندانی مرقدوں کی بارہ دریاں اور کوٹھیاں۔ سارا ماحول کچھ ترکی، کچھ یوروپین سا ہے۔ اندر حوض میں فوارے چل رہے ہیں اور چند بوڑھے مرمریں کناروں پر بیٹھے تسبیح پھیرنے میں منہمک ہیں۔ گلی سے باہر نکلتے ہی زندوں کی دنیا میں واپس شاہراہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ شور شغب، ٹریفک، ہجوم، موٹروں اور بسوں کی ریل پیل۔

قم (جسے اہل ایران غوم کہتے ہیں غ سے) صادقہ نے کہا وہاں جانے کے لئے برقعہ کی ضرورت ہے ورنہ کم از کم موزے پہننے لازمی ہیں۔ قم مشہد کے بعد ایران کا دوسرا بڑا دینی مرکز ہے اور قدامت پسند علماء کی آماجگاہ ہے ہم لوگوں نے جاکر بازار سے موزے خریدے۔ میری سرکاری کار کے شوفر آقائے احمد عرب نژاد اور بہت دوست آدمی تھے۔ مجھے اور صادقہ کو لے کر قم روانہ ہوئے۔ طہران سے شاید سو میل دور تیز دھوپ۔ دونوں طرف چٹیل بے برگ و گیاہ میدان، آبادی ناپید۔ آدھے راستے جاکر تازہ دم ہونے کے لئے ایک گاؤں کے کنارے آقائے احمد نے کار روکی۔ شاہراہ کے کنارے چند خستہ قدیم مکان کھڑے تھے۔ ایک دراز قد عورت سیاہ چادر میں ملفوف ایک ڈیوڑھی سے نکل پر چھائیں کی مانند ایک گلی میں غائب ہو گئی۔ سامنے چائخانے میں لوگ باگ بنچوں پر بیٹھے حقہ اور چاء پی رہے تھے۔ یہ وہ "پراسرار مشرق" ہے جس کی تصاویر یوروپین مصور تین سو سال سے بناتے چلے آئے ہیں نہ کہ طہران کی بوتنگ ایلی۔

ساتھ لایا ہوا ناشتہ کر کے اور چاء خانے سے خرید کر کوک پینے کے بعد ہم لوگ پھر منزل مقصود کی سمت روانہ ہوئے۔

اچانک دور تیز نیلے آسمان کے افق پر ایک جگمگاتا آفتاب نمودار ہوا خیرہ کن سونے کا عظیم الجثہ ڈلا۔

"معصومہ غوم۔" آقائے احمد نے لرزاں آواز میں کہا۔

یا بنتِ رسول اللہ! یا خواہرِ امام رضاؑ۔ ہم لوگوں نے بے اختیار

درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ اور بے طرح جی بھر آیا۔ لاشعوری مذہبی جذبات کا کوئی سائنٹیفک تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہم شہر میں مودبانہ داخل ہوتے۔ ایک سنسان چوراہے سے گزرے۔ اونچے پوپلر کے درختوں کے نیچے ایک بنچ پر بیٹھی سیاہ لباس میں ملفوف چند معمر عورتیں باتوں میں مصروف تھیں۔ اب یہاں سے پھر نیم مشرقی یورپ شروع ہو گیا۔ یہ منظر، ترکی، یوگوسلاویہ اور یونان کا بھی ہو سکتا تھا۔

ایرانی عوام

عظیم الشان روضہ معصومۂ قمؑ سارا کا سارا سونے چاندی اور جواہرات میں ڈھلا ہوا ہے۔ موزے پہن کر اور ساری کے آنچل سے سر اچھی طرح ڈھانپ کر میں اور صادقہ صحن میں گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک معلم لپکا ہوا آیا۔ ایرانی روضوں پر پاکستانی زائرین کی کثرت کی وجہ سے ساری پوش خواتین کو دیکھتے ہی معلمین ان کی طرف دوڑتے ہیں اور ان کی خوش الحانی اور قرأت اس قدر مسحور کن اور حیرت انگیز ہے کہ اسے سن کر بغیر کچھ سمجھے ہی انسان مسلمان ہو جاتے۔ مقبرہ کا روضہ (روضہ یعنی باغ) لہلہا رہا تھا۔ حوض، نہریں، سرو شمشاد، عزبابہ کے ہجوم، مقبرے کے اندر ضریح مقدس کے گرداگرد کھچا کھچ عزبابہ کا ہجوم۔ ایک کونے میں ایک مسکین صورت جوان منگول خستہ شلوار پہنے دروازے میں کھڑا ایک پرانا شکستہ قرآن شریف پڑھنے میں مصروف تھا۔ ایک مصیبت کی ماری عورت ضریح کی جالی پکڑ کر چلا چلا کر "یا بی بی! یا بی بی" پکار رہی تھی۔ اور رو رو کر

جناب معصومہؑ سے اس طرح باتیں کر رہی تھی۔ گویا وہ سامنے موجود ہیں۔ ضریح کے اندر سنگِ موسیٰ کا سادہ مزار جس کے اوپر جناب معصومہؑ کا ذاتی قرآن شریف رحل میں رکھا تھا۔

مجھ پر اور صادقہ پر بڑی رقّت طاری ہوئی کہ اچانک ایک دیہاتی عورت نے مجھے ایک جھانپڑ رسید کیا اور غصہ سے بولی "کافر یچی" لپ اسٹک لگا کر یہاں آئی ہے"!

میں اور صادقہ بھیڑ کے دھکے کھاتے فی الفور وہاں سے کھسک لئے۔ روضہ سے ملحق اس شیش محل میں پہنچے جہاں شاہانِ قاچار کی حجرہ اور قبریں موجود تھیں۔ عوام الناس کے دھکے کھاتے باہر آئے۔ ایک معلّمہ نے کہا زنانہ مسافر خانے میں جا کر آرام کر لیجئے۔

روضے کے قریب گلی میں ایک دو منزلہ مکان کھڑا تھا جس کے معمولی کمروں کے فرش پر ایران کے دُور افتادہ صوبوں سے آئی ہوئی عورتیں برقع اوڑھے بیٹھی تھیں۔ بالکل جس طرح ہمارے ہاں اجمیر شریف کے زنانہ مسافر خانوں کا منظر ہوتا ہے۔ تہران ہلٹن کے بعد قم کی سرائے ایک اور دنیا تھی۔ یہی شہر علماء اور ملاؤں کا بڑا مرکز اور موجودہ انقلاب کا ایک گڑھ ہے۔

تہران واپس آکر ایک روز میں نے صادقہ اور مصطفٰے جعفری سے کہا۔ "شاہ بانو نے ذکر کیا ہے کہ تہران سے باہر حضرت شہر بانو کا مزار بھی ہے۔ اسے ضرور دیکھنا۔ گو اس کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے۔"

جمعہ کے روز جو ایران میں چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ میں کوچہ آبشار خیابان میکدہ سے صادقہ اور مصطفےٰ کو ساتھ لے کر شہر سے باہر روانہ ہوئی۔ مزار ایک پہاڑی پر تھا۔ اس روز بھی دھوپ بہت تیز تھی۔ پہاڑی کے نزدیک سنسان سڑک کے کنارے کوکا کولا کی چند دوکانیں نظر آئیں۔ میں نے آغائے احمد سے کہا کار روکیے تاکہ ہم لوگ کوک پی لیں۔ آغائے احمد کار چلاتے رہے۔ میں نے دوبارہ کہا۔

"آغا بہت گرمی پڑ رہی ہے۔ کیا آپ کا جی کوک پینے کو نہیں چاہ رہا۔ یہ اتنی دوکانیں سامنے موجود ہیں۔"

آغائے احمد کار چلاتے رہے۔

اب مصطفےٰ جعفری نے ان سے کہا۔ ان کی اس "حکم عدولی" پر ہم سب متعجب تھے۔ چند منٹ بعد آغائے احمد نے فرمایا:

"وہ دوکانیں سب یہودیوں کی تھیں، میں آپ کو مسلمان کی دوکان پر لئے جا رہا ہوں۔"

ہم لوگوں نے ایک مسلمان کی دوکان پر ٹھہر کر کوک پیا۔ کار پہاڑی راستے پر چڑھنے لگی۔ آغائے احمد نے اطمینان سے فرمایا:

"اس پہاڑی میں کان کنی کے لئے MINES بچھا دی گئی ہیں۔"

"تو بھیّا ـــ چلو واپس۔ ورنہ بھک سے اُڑ جائیں گے۔" مصطفےٰ جعفری بولے

ہم لوگ فرازِ کوہ پر پہنچ چکے تھے۔

جس ملک میں امام زادوں کے مقابر ایسے عالیشان ہوں وہاں جناب

شہر بانو کا مزار ایسا معمولی۔ جیسے ہمارے ہاں کسی مقامی پیر فقیر کی چھوٹی سی درگاہ برگد تلے۔ اس مزار کی تاریخی حیثیت یقیناً بے حد مشتبہ تھی۔

مزار کی معمولی سی عمارت کے صحن میں مجاور صاحب موجود۔ زائرین مفقود اندر ایک کمرے میں ایک اونچی تربیت پر سادی سبز چادر۔ اوپر حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کی "تصاویر" فریم میں۔ دیوار پر پورا "فیملی گروپ"

"اہلبیت اطہار ـــ" مجاور نے "فیملی گروپ" کی طرف اشارہ کیا۔ مصطفےٰ جعفری چیں بجبیں ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ صریحاً مزار بالکل فرضی تھا۔ لیکن میں نے اور صادقہ نے فاتحہ پڑھ ڈالی۔ JUST IN CASE-

باہر آتے مجاور نے کہا "پہاڑی پر پانی نہیں پہنچتا۔ بہت تکلیف ہے" مصطفےٰ فوراً بولے "ان خانم سے کہیے یہ علیا حضرت کی مہمان ہیں۔ علیا حضرت سے کہہ دیں گی۔" میں فوراً باہر نکلی۔ ٹین کی چھت والے برآمدے کے نیچے ایک چٹان آدھی ٹوٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مجاور بولے "پاکستانی زائرین آ کر پتھر کے ٹکڑے توڑ توڑ کر لے جاتے ہیں اس وجہ سے چٹان آدھی رہ گئی۔ آپ کو بھی ٹکڑے چاہئیں؟"

"جی نہیں۔ مگر اس چٹان میں کیا خاص بات ہے؟" میں نے کہا۔

جناب شہر بانو نے جنگ کربلا کے بعد دعا مانگی تھی کہ اپنے وطن واپس چلی جائیں۔ چنانچہ ایک گھوڑا نمودار ہوا۔ آپ اس پر سوار ہوئیں۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا سیدھا ہماری شہزادی کو یہاں لے آیا۔ اور اس چٹان پر اترا۔ وہ دیکھیے چٹان پہ اس کے سُم کے نشان موجود ہیں" مجاور نے کہا۔

" توبہ کیجئے۔ توبہ کیجئے۔ کیا پتہ صحیح واقعہ ہو۔" آقائے احمد بولے۔ حالانکہ مزار کے متعلق وہ بھی کافی ڈھلمل یقین معلوم ہو رہے تھے۔

واپسی میں شہر جانے والی شاہراہ پر شلوق شدید تھا۔ موٹریں۔ ٹرک۔ بسیں ٹریفک جام۔

" سلورغ شدید ست۔" آقائے احمد نے کہا۔ عمارتوں پر مسلسل چوبیس گھنٹے چراغاں رہتا تھا۔

" برقی قمقموں کی عظیم الشان مالائیں، طرح طرح کے برقی گل بوٹے۔ اسراف اور فضول خرچی مسلمانوں کی عادت ہے۔

راستے میں ایک نہایت عالی شان ڈیپارٹمنٹ اسٹور نظر آیا۔ میں نے کہا چلو اسے بھی دیکھتے چلیں۔ وہ ورکنگ کلاس ایریا تھا اور ڈیپارٹمنٹ اسٹور بذاتِ خود ایک پورا شہر، ہر منزل پر قوالے چل رہے تھے۔

مصطفےٰ جعفری نے کہا۔ تو یہاں کے نچلے متوسط طبقے والوں کے لئے ہے گویا مارک اینڈ اسنسرز۔ یا بارکلیز۔ بڑھیا ڈیپارٹمنٹ اسٹور تو آپ شہر کے دوسرے حصے میں دیکھ ہی چکی ہیں مثلاً ہماری خانم جو ہمارے ہاں برتن دھونے آتی ہے۔ وہ اپنے فراک یہاں سے خریدتی ہو گی۔

" چلئے ایک خالص عوامی علاقے میں چل کر ایرانی فلم دیکھیں۔ میں نے کہا۔ آغائے احمد آج کل کون کون سی اچھی فلمیں چل رہی ہیں۔؟"

انہوں نے تین چار امریکن فلموں کے نام گنائے۔

" لیکن ایرانی فلم — ؟" میں نے پوچھا۔

"میں صرف امریکن یا مصری یا ہندوستانی یا ترکی فلم دیکھتا ہوں۔ ایرانی فلم دیکھنے کے لائق نہیں ہوتے۔"

"ہم کو آپ کسی ایرانی فلم ہی میں لے چلیئے۔" میں نے اصرار کیا۔

وہ بادل ناخواستہ ایک بازار میں پہنچے" وہ دیکھیے سامنے ایک ترکی فلم چل رہا ہے وہ دیکھ لیجیے۔"

"نہیں۔ ایرانی فلم۔" میں مصر رہی۔ ہم لوگوں نے اتر کر ٹکٹ خریدے۔ بے حد عوامی سینما ہال تھا۔ چادر پوش عورتیں۔ مزدور اور کاریگر حضرات۔ آٹھ برس بعد ابادان کے سینما ہال میں ایک ایرانی فلم دیکھتے ہوئے اسی طرح چار سو ایرانی مرد و زن و بچہ جل کر خاک ہوا۔

طہران کے اس عوامی سینما گھر کے باہر صاف ستھرے چار خلنے۔ فیروزے کی دوکانیں۔ گہما گہمی، جیسی ایک مشرقی بازار میں ہونی چاہیئے۔ یوروپین نما الٹرا فیشن ایبل ڈاؤن ٹاؤن سے مختلف جہاں کی فروشگاہوں پہ پیرس اور لندن کی دوکانوں کا دھوکا ہوتا ہے۔

راقم الحروف کے والدین کے پرانے دوست کرنل رحمٰن اور بیگم کشور رحمٰن کے صاحبزادے ارشی رحمٰن جو ان دنوں ایران میں سفیر ہند تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ ہم تبریز جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیے ایرانی آذربائیجان گھوم آئیے۔

لیکن مجھے ایک ٹیلی ویژن پروگرام کے لیے رکنا تھا۔ طہران ٹی وی کا شاید ہفتہ وار آدھ گھنٹے کا پروگرام MEET THE WORLD PRESS ہوتا تھا۔

یون گھنٹے کے انٹرویو میں انہوں نے ہندوستانی صحافت کے متعلق سوالات کئے۔
تیسرے روز میں نے صادق کے ہاں وہ پروگرام دیکھا۔ انگریزی انٹرویو کا بیک
وقت فارسی ترجمہ کیا گیا تھا۔ وقفے وقفے سے انگریزی مکالمے کو مدھم کر کے فارسی
ترجمہ کی آواز SUPERIMPOSE کر دی جاتی تھی۔ دوسری شام ایک ڈپلومیٹک
دعوت میں مجھے ایک ایرانی نوجوان قانون دان ملے جو غالباً زیر زمین بائیں بازو سے
تعلق رکھتے تھے اور شاہ کے مخالف تھے انہوں نے بہت طنزیہ انداز میں
دریافت کیا آپ شاہ بانو کی سوانح حیات لکھتے ہیں ؟ میں نے کہا میں ایک صحافی
ہوں اور کسی بھی موضوع پر لکھ سکتی ہوں۔ وہ مسکرا کر چپ ہو گئے اس پورے
دوران قیام میں صرف یہی ایک سیاسی بات مجھ سے کسی نے کہی تھی۔

سیاست کی خنک موضوع گفتگو صرف ایک تھا شاہ اور شاہ بانو اور ان کے
کارنامے۔ ہر جگہ ان دونوں کی تصاویر۔ اخبارات ان کی تصاویر سے پر۔ ایک روز
ن۔ م۔ راشد کہنے لگے۔ یہاں صرف ایک چرچا ہے۔ خدا اور اس کی بیوی۔ راشد
صاحب جدید ایرانی شاعری کے بے حد مدّاح تھے۔ میں نے پوچھا آپ عرب دنیا
سے بھی خوب واقف ہیں۔ عربی شاعری کیسی ہے ؟ کہنے لگے بس جیسے عرب
ہیں ویسی ہی ان کی شاعری ہے۔

مسٹر خوشونت سنگھ اور مسٹر بدرالدّین طیّب جی طہران پہنچے۔ دونوں کویت
سے آرہے تھے۔ ہلٹن میں ٹھہرے۔

کاخ نیاوراں

لندن سے رمیش سنگھوی۔ مع انگریز مشہور فوٹو گرافر کے آئے۔ شاہی
خاندان کی تصاویر کھینچیں۔ پبلشر نے مجھ سے کہا اگر تم چاہو تو ہر میجسٹی کی فرینچ
ساتھیوں سے ملنے کے لئے پیرس کا چکر یہیں سے لگا آؤ۔ میں نے کہا جب میں
مسودے کی آخری دیکھ بھال کے لئے مارچ میں لندن آؤں گی تب دیکھا جائے
گا۔ یہاں میں شاہ بانو، ان کے رشتہ داروں، سہیلیوں، کارکنوں، اراکین حکومت،
فن کاروں اور ماہرین تعلیم وغیرہ وغیرہ سے مل کر کتاب کے لئے تقریباً سارا مواد
جمع کر چکی تھی۔ نومبر کا مہینہ ختم ہونے والا تھا۔ کاخ نیاوراں میں اس آخری شام
ٹیل کورٹ میں ملبوس انسان نے امپریل کریسٹ والے ٹی سیٹ میں (جس کے
چمچے خالص سونے کے تھے) حسب معمول چاء لاکر رکھی اور دبے پاؤں واپس
آگیا۔ شاہ بانو نے چاء بناتے ہوئے آہستہ آہستہ سے کہا۔ خزاں کا موسم میرے لیے
بہت اہم ہے یہ ایران میں حرکت کا موسم ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں یہاں اکٹھے اتنے
جشن منائے جاتے ہیں،، ہندوستانی پریس اتاشی نے جو ایک سردار صاحب
تھے۔ عصرانہ دیا (اس میں بلواج مدھوک بھی موجود تھے) ایک شام خوشونت سنگھ
کو تہران پی۔ ای۔ این نے مدعو کیا۔ وہاں ہال میں بالکل اسی قسم کے پارسی نما بوڑھے
اور بوڑھیاں موجود تھے۔ جو بمبئی پی۔ ای۔ این کی میٹنگوں میں نظر آتے ہیں خشونت
سنگھ ایسا عجیب دلچسپ مجمع دیکھ کر کافی پژمردہ ہوتے۔ کہنے لگے تم میرا تعارف
کر دینا۔ میں نے آٹھ دس منٹ موصوف کے۔ اس کے بعد آپ نے حسب

عادت ایک دلچسپ تقریر کی مگر مجمع پر کوئی ردِّ عمل نہ ہوا۔ اسی طرح سنجیدہ شکلیں بنائے بیٹھے رہے۔ میٹنگ میں چند سردار صاحبان بھی تھے۔ وہ مسٹر خشونت سنگھ کو مدعو کرنے آئے تھے ہم لوگ اُتر کر نیچے سڑک پر پہنچے۔ فٹ پاتھ سنسان تھی۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے کھڑے ہو کر ایک سردار صاحب نے کہا "سیاسی قیدیوں کو چوراہے پر پھانسیاں دی جاتی ہیں۔ ابھی حال میں ایک نوجوان کو سولی پہ لٹکایا گیا ہے"

"NAPOLEONIC CODE اب تک رائج ہے" کسی نے جواب دیا۔

سیاست کے متعلق صرف یہ دو جملے اور تھے جو میں نے سُنے۔

"امام محمد المہدی القائمَ المنتظر" کا یوم پیدائش۔ تمام شاہی سالگرہیں۔ اکتوبر میرے لئے بہت اہم ہے۔ میں اسی مہینے میں پیدا ہوئی۔ میرا پہلا بچہ اکتوبر میں پیدا ہوا اور ۶۷ء میں اسی مہینے میں مجھے تاج شاہی پہنایا گیا۔ میری سہیلیاں مجھ سے کہتی ہیں میں ایک بے حد خوش نصیب لڑکی ہوں۔ ایسا لائق شوہر۔ اتنے پیارے اور ذہین بچے۔ اتنی عزت میرے پاس سب کچھ موجود ہے مگر اس کے باوجود میں بعض دفعہ بہت اداس ہو جاتی ہوں۔ دنیا میں اتنی بے انصافی اور اتنی ریاکاری اور اتنا دکھ ہے۔ اس لمحاتی قنوطیت کو جھٹک کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہوں۔"

دریچوں کے باہر باغ میں زرد پتوں کے قالین بچھ چکے ہیں۔ گلشن میں فوارے منور ہو جاتے ہیں۔ شاہ بانو کا ایک کتا اندر آ کر اطمینان سے صوفے کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کہتی رہتی ہیں "خزاں ایران میں طمانیت کا موسم بھی

ہے۔ لائف ان سلو موشن ۔۔ آہستہ خرام اور پرسکون۔ مناظرِ قدرت میرے لئے بہت اہم ہیں، ہوا کے جھونکے کی لاتی ہوئی ایک خوشبو سے گزرے وقت کی یاد دلا جاتے۔ صبح و شام کی بدلتی پرچھائیاں۔ موسیقی کی کوئی دھن جو کسی روز دیس میں سنی ہو اور وہ کوئی اور دھن سنکر اچانک یاد آجاتے۔ درختوں کے نیچے بہتا نہر کا پانی۔ سڑکوں پر گرتے پتے۔ پہاڑوں پہ پھیلتی صبح کی روشنی۔ رات کو دریچوں میں سے باہر چھلنی زرد روشنیاں۔

"میں لوگوں کے بارے میں بہت جذباتی ہوں۔ ایسے لوگ جن کو میں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ میں نے اپنی دایہ منوّر خانم مرحومہ کی آواز ٹیپ کر کے رکھی ہوئی ہے مجھے اپنے سارے رشتہ داروں سے بہت محبت ہے میرے وہ چچا جو ہز میجسٹی کے چیمبرلین تھے، اور جو ہر سال نوروز پر درباری انعام کی پہلوی اشرفی لاکر مجھے دیا کرتے تھے اب پیرس میں رہتے ہیں۔ پیرس سے بھی ہمارے گھرانے کی قسمتیں عجیب طرح وابستہ رہی ہیں میرے والد اور چچا سپہر، آب اور بہرام دیبا ۱۹۱۷ء میں ماسکو سے ریفیوجی بن کر وہاں پہنچے تھے۔ وہیں ۱۹۲۱ء میں ایک فرینچ اخبار میں میرے بابا نے پڑھا کہ ایران میں انقلاب آگیا ہے اور چالیس سال بعد پیرس کے اسی فرینچ اخبار نے میرے ہاں ولی عہد تولد ہونے کی خبر خوشی کے مارے بطور خاص فارسی رسم الخط میں شائع کی۔ اہلِ فرانس کے اور میرے درمیان ایک خاص قسم کا جذباتی رشتہ موجود ہے۔"

میں نے سوچا اس تمام عرصے میں روس، یورپ اور ایران کتنا بدلا۔ ان پچھلی دہائیوں کے متعلق تصوّر کیجیے تو پڈوکن کی کسی فلم کے مناظر معلوم ہوں۔

۔ بمعہ کی ایک خنک خوشگوار صبح علیاحضرت سے آخری ملاقات کے بعد میں نیچے آئی۔ ایک کمرے میں چند درباری تاش میں مصروف تھے ایک ڈرائنگ روم میں وزیرِ صنعت آقائے ہوشنگ انصاری موجود تھے۔ ہال میں مادام فریدہ دیبا کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ باہر باغ میں سرد ہوا چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ خانم لیلےٰ امیر طہماسپ اپنی انتہائی بیش قیمت فرنچ کار تیزی سے ڈرائیو کرتی محل کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھیں۔ پھاٹک کے دفتر سے سیکیورٹی افسر نے آغائے احمد کو کار اندر لانے کے لئے فون کیا۔

کار نیاوران سے اتری۔ دور کسی پہاڑی راستے پر ایک چادر پوش عورت خچر پر بیٹھی ہوتی جا رہی تھی۔ ایران لازوال ہے۔

اب کوہستانی اور صحرائی اور دیہاتی چارخانوں کے اندر سمور میں ملبوس لوگ سماواروں کے گرد بیٹھ کر گزرے وقتوں اور آنے والے وقتوں کی باتیں کریں گے ان کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیستول کے پتھروں سے تراشے گئے ہیں یہ بوڑھے اور جوان کسان، گڈریے، پھل فروش شاہنامہ فردوسی سنتے ہیں۔ رستم و سہراب و سائرس و شاہ عباس اور رضا شاہ کبیر و محمد رضا پہلوی و فرح پہلوی ـــ یہ سب کیا ہے؟ پرسی پولس کے زینے کی دیوار پر بنے میخی مجسمے؟ تقدیر و تدبیر کیا ہے اور انسان مجبور ہے یا خود مختار؟ اور کاشان کے کارخانوں میں لڑکیاں کرگھوں کے سامنے بیٹھی قالین بنتی چلی جا رہی ہیں تاریخ کے نمونوں اور گلکاریوں کا تانا بانا۔

۔ ۔ ان کا موسم خزاں نرم جذباتی گہرائی اور نوسٹلجیا کا موسم ہے۔ جب

پرانی حکایات آتش دان کے شعلوں میں سنہرے پیکر حاصل کر لیتی ہیں کیونکہ موسم خزاں میں ماضی اور مستقبل دونوں شامل ہیں۔ پرانے پتّے گر رہے ہیں۔ بہت جلد نئے پتّے نکلیں گے۔

کاخ نیاوراں کے اونچے درخت بادِ شمالی میں سرسرا رہے تھے۔ عنقریب موسم سرما کے بادل کوہ دماوند پر چھا جائیں گے۔ اس کے بعد بہار آئے گی اور شمران میں نغمۂ ہزار گونجے گا۔

اختتامیہ:

اختتامیہ: میری انگریزی کتاب "دی ایمپریس" یورپ کی چھ زبانوں میں شائع کی جانے والی تھی۔ اسی زمانے میں مشہور ماہر ایرانیات اور برطانوی مورخ رچرڈ فرائی تاریخ ایران پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھے "دی ایمپریس" اور رچرڈ فرائی کی کتاب رمیش سنگھوی اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ڈھائی ہزار سالہ جشن کے پہلے روز کرنے والے تھے۔ شروع دسمبر میں تہران سے بمبئی واپس آکر میں نے کتاب لکھنی شروع کر دی ڈیڑھ ماہ میں اسے مکمل کر کے شروع فروری میں مسودہ لندن بھیج دیا۔ حسبِ عادت مسودے کی نقل اپنے پاس نہیں رکھی مارچ کے مہینے میں رمیش سنگھوی وہ مسودہ لے کر نیویارک گئے۔ کتاب لندن و نیویارک سے بیک وقت چھپنے والی تھی۔ پبلشر نیویارک میں HARPERS یا COLLIERS رسالوں میں اسے بالاقساط شائع کرنے کی گفت و شنید بھی کر رہے تھے اسی ماہ مارچ میں بے چارے رمیش ایک مہلک مرض میں گرفتار ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ ان کی اچانک علالت کی وجہ سے

میں اس دوران میں لندن جاکر معاہدے کے کاغذات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ ان کے اچانک انتقال کے بعد ان کے پبلشنگ ہاؤس میں افراتفری مچی۔ انکی سیکرٹری نے میرا مسودہ گنوا دیا۔ غلطی سراسر میری تھی کہ نہ میں نے اس کی نقل اپنے پاس رکھی نہ پہلے سے معاہدہ کیا (اس قسم کی حماقتیں میں ہمیشہ کرتی رہتی ہوں کوئی نئی بات نہیں) قصہ مختصر آں دفتر را گاؤ خورد۔

بے تحاشا دولت کی ریل پیل۔ افراطِ زر اور شدید کرپشن سنہ ۷۴ء سے شروع ہوا۔ لیکن اس وقت بھی ایران کا تموّل خیرہ کن تھا۔ اوپری طبقہ تکبّر میں مبتلا اور عیش و عشرت میں مصروف لوگ بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھو رہے تھے (بر سبیل تذکرہ بحیثیت مہمانِ علیاحضرت، طہران کی جس دکان سے جو چاہتی خریدتی اور اس کا بل منسٹری آف کورٹ کو بھیج سکتی تھی لیکن میں نے بوجہ ایمانداری ایسا نہیں کیا۔ جیسی گئی تھی۔ ویسی واپس آگئی۔ پیٹرو ڈالرز کے اس سیلاب میں یار لوگوں نے کروڑوں کے وارے نیارے کر لئے جہاں موقع ملا ہاتھ مارا۔ اس سارے ہولناک کرپشن کا نتیجہ آج سامنے موجود ہے۔ حال ہی میں مجھ سے ایک ایرانی دوست نے کہا کہ جس وقت آپ ایران گئی تھیں۔ اس وقت حالات اتنے خراب نہیں تھے اور شاہ اور خصوصاً شاہ بانو کافی حد تک مقبول تھے۔

کسی ملک میں چند ہفتے یا دو ماہ گزارنے کے بعد اس ملک و قوم کے متعلق فیصلے صادر کرنا صحافیوں کی عام کمزوری ہے اکثر یہ تحریریں سرسری اثرات، سنی سنائی باتوں، سرکاری پبلسٹی اور ورسٹ لٹریچر اور چند ذاتی تجربات پر

مبنی ہوتی ہیں۔ایران کے متعلق میں بھی یہی غلطی کر سکتی ہوں۔گو ایران ہمارے لئے ایک غیر اجنبی ملک نہیں ہماری تہذیب کا ایک حصّہ ہے لیکن ۷۶ یا ۷۰ء کے ایران جاکر کوئی بھی دھوکہ کھا سکتا تھا کہ یہ ملک جو دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور فخریہ اپنے آپ کو خاورمیانہ کا جاپان کہنے لگا ہے اس کا شاہی نظام کم از کم کراؤن پرنس رضا کی تخت نشینی تک تو برقرار رہے گا۔اعلیٰ حضرت ولی عہد ہمایوں کی تصاویر ہر طرف جلوہ افروز تھیں اور انہوں نے تھوڑا تھوڑا پبلک لائف میں آنا بھی شروع کر دیا تھا۔میں نے ان کو تاجگذاری کے موقع پر والدین کے تخت کے پاس بیٹھے دیکھا تھا اور وہ اس کم سنی میں شاہانہ انداز اختیار کر چکے تھے۔لیکن مرحوم شاہ فاروق کیا ہم نہیں پیٹر و ڈالر کی بات کہہ گئے کہ بادشاہ صرف پانچ بچیں گے۔تاش کے چار اور پانچویں شاہ برطانیہ مجھے یاد آتا ہے۔اکتوبر ۱۹۶۷ء میں جشن تاجگذاری کے بعد جب میں ہلٹن سے ایئرپورٹ روانہ ہو رہی تھی۔اُسی وقت بمبئی کے ایک امریکن دوست مل گئے جو چند گھنٹے قبل تہران پہنچے تھے۔شہر روشنیوں سے بقعہ نور اور ہر طرف شاہ شاہ بانو اور ولی عہد ہمایوں کا چرچا انہوں نے آنکھیں پھیلا کر مجھ سے کہا GEEI THIS KING

DUSINESS IS GOOD DUSINEH

اور آج ۵ر جنوری ۱۹۷۹ء کے روز جب ایران میں تخت طاؤس ڈانوا ڈول ہے،پرانے کاغذات میں سے وہ شاندار دعوت نامہ نکلا۔

"بیاری پروردگار توانا۔مراسم فرخندہ تاجگذاری اعلیٰ حضرت محمد رضا پہلوی آریہ مہر شاہنشاہ ایران و علیاحضرت فرح پہلوی

شاہ بانوئے ایران درکاخ گلستان برگزار میشود۔

وزیر دربار شاہنشاہی دعوت میخاید۔ ساعت ½۹ صبح روز پنج شنبہ چہارم آبا غاہ یک ہزار و سیصد و چہل و شش درکاخ گلستان حضور بھم رسانند۔"

لیکن وقت کی دیوار پر جو حروف نمودار ہوتے ہیں کیا ان کو پڑھنے کے لئے اب بھی کسی دانیالؑ نبی کی حاجت ہے؟

ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف	کتاب	مصنف
کارِ جہاں دراز ہے (حصّہ اوّل)	قرۃ العین حیدر	پاگل	خلیل جبران
، ، (حصّہ دوم)	، ،	محبت اور جدائی	، ،
آگ کا دریا	، ،	ایک گدھے کی سرگذشت	کرشن چندر
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	، ،	پھول کی تنہائی	، ،
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	الٹا درخت	، ،
پطرس کے خطوط	، ،	محبت کی رات	، ،
زیرِ لب	صفیہ اختر	مضامین کرشن چندر	، ،
حرفِ آشنا	، ،	لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
گنجے فرشتے	منٹو	نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
انارکلی	، ،	کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی
ٹھنڈا گوشت	، ،	آتشِ گل	، ،
کرنیں	شفیق الرحمٰن	کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ	تلخیاں	، ،
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی	گلِ نغمہ	فراق گورکھپوری
زرد پتے	خلیل جبران		

مکتبہ اُردو ادب لاہور